عمیرہ احمد

دلہنیا

پچھلی قسط کا خلاصہ

مراد کی بارات حویلی نکلتی ہے، ڈھول تاشوں کا شور اور سکوں کی برسات میں برات موتیا کے گھر کے سامنے پہنچتی ہے۔ گاموا استقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ تاجور کہتی ہے بارات کا راستہ صاف کراؤ بارات نے دوسرے گاؤں جانا ہے۔ گاموکے علم میں آتا ہے کہ چوہدری شجاع نے مراد کا رشتہ اپنے سالے کی بیٹی کے ساتھ کردیا ہے۔ موتیا پر سکتے کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

ماہ نور بیاہ کر حویلی آجاتی ہے، مراد گھونگھٹ اٹھاتا ہے تو اس کے منہ سے بے اختیار موتیا کا نام نکل جاتا ہے۔ شکوراں، بتول کی شادی سے ایک رات پہلے اسے بتاتی ہے کہ کس طرح تاجور نے موتیا کی بے عزتی کی۔ وہ

ے موتیا کی ذہنی حالت کے بارے میں بھی بتاتی ہے۔ بتول دل میں ڈرتی ہے کہ کہیں کسی کو خبر نہ ہو جائے کہ اس کی ذمہ دار بتول ہے۔ گامو، موتیا کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتا ہے تاکہ انہیں اپنی بیٹی کی حالت دکھا سکے جس کی ذمہ داران کی بیٹی تاجور ہے۔ پیر ابراہیم موتیا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان کے خاندان کو بدعا نہ دے۔ اس دن ماہ نور پہلی بار موتیا کو دیکھتی ہے اور اس کے حسن کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے۔

پیر ابراہیم تاجور سے کہتے ہیں کہ وہ گامو اور اس کے خاندان سے معافی مانگے۔ وہ انکار کر دیتی ہے مراد واپس انگلینڈ چلا جاتا ہے۔ حویلی میں نئے مہمان کی خوش خبری ہے۔ مراد فون پر بھی ماہ نور سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ اس کا دھیان اکثر موتیا کی طرف چلا تا ہے۔

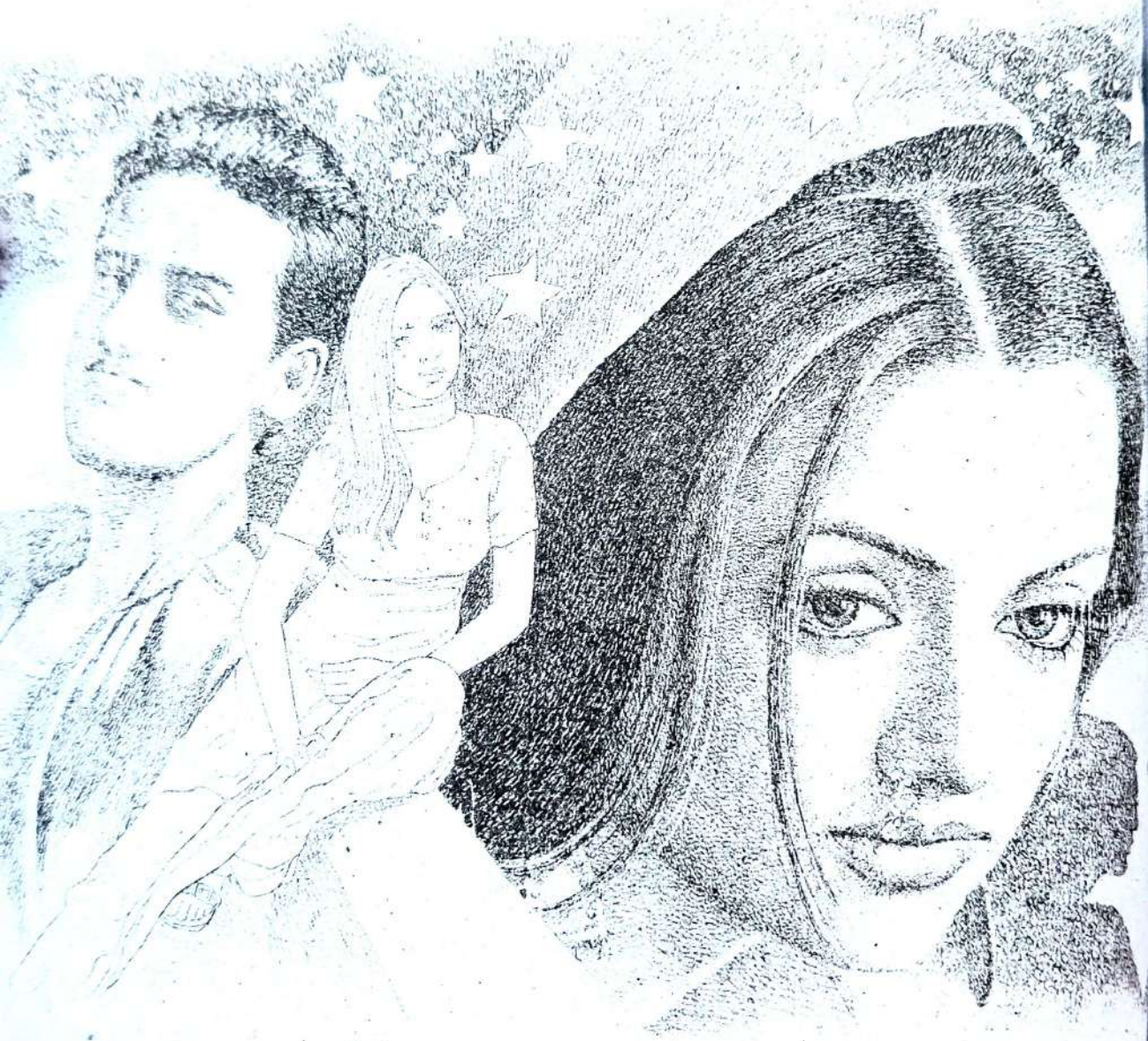

موتیا گاؤں میں پاگل مشہور ہو جاتی ہے۔ گامو اللہ سے شکوہ کرتا ہے کہ حویلی میں خوشیاں آ رہی ہیں جبکہ اس کی بیٹی اب تک زندگی کی طرف نہیں لوٹی ہے۔ یہ انصاف نہیں ہے۔

اللہ وسائی اور وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے پھر اللہ وسائی نے اس سے کہا۔

"موتیا کو کون مارے گا؟" گامو اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا

"تو!"

آخری قسط

عشق تے آتش سیک برابر
سانوں عشق دا سیک چنگیرا
اگ تے ساڑھے ککھ تے کانے
عشق ساڑے تن من میرا
اگ دا دارع مینہ تے پانی
دس عشق دا دارو کیہڑا
(آگ اور عشق دونوں ایک طرح سے جلاتے ہیں
لیکن ہمیں عشق سے جلنا پسند ہے
آگ تو صرف گھاس پھوس جلاتی ہے
مگر عشق میرا تن جلاتا ہے
آگ تو پانی سے بجھ جاتی ہے
مگر مجھے بتاؤ عشق کس دوا سے ختم ہوتا ہے)

اُس بُت نے دعا کی تھی کہ وہ واقعی بُت ہوتا..... جو اُس نے سُنا، نہ سُن سکتا، جو اُس نے دیکھا، نہ دیکھ پاتا اور اگر پہلے نہیں تھا تو اب بُت بن جاتا، رہ ہی کیا گیا تھا اب دُنیا میں؟

وہ وہاں آنے سے پہلے بھی مجرم بن کر آیا تھا، مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ بتول سیدھا اُسے پھانسی کے تختے پر لٹکا دے گی۔ وہ تو اتنے لمبے عرصے کے بعد گاؤں آنے پر حویلی جانے سے بھی پہلے گامو کے گھر آیا تھا، تعزیت کرنے اور موتیا کا حال جاننے۔ اُس کے ملازم نے اُسے بتایا تھا گامو کے بارے میں جب وہ اُسے اسٹیشن سے لینے آیا تھا اور مراد اُسے یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ اتنے عرصہ بعد واپس ہی اس لیے آیا تھا کہ وہ اُس کے گھر جا سکے۔

''اسلم حویلی کے بجائے گامو کے گھر چلو۔''

اُس نے گاڑی چلانے والے ملازم سے کہا تھا۔ گامو کے گھر سے بہت دور گاڑی روک کر وہ پیدل اُس کی گلی میں آیا تھا اور اُس گلی میں آتے ہوئے اُسے چند سال پہلے ایک چھت پر کھڑی وہ دلہن یاد آئی تھی۔ اُس نے بے اختیار آج بھی سر اُٹھا کر جیسے اُس گلی میں گامو کے گھر کی چھت پر اُس وجود کو ڈھونڈنا چاہا تھا، وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

گامو کے گھر کا دروازہ کھلا تھا اور مراد نے دہلیز پر قدم رکھ کر اُس دروازے کو بجانا چاہا تھا، جب اُس نے اندر سے آتی بتول کی آواز سنی تھی اور پھر وہ انسان سے بُت میں بدل گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کون سی ریل کی پٹری تھی جس پر وہ لیٹا ہوا تھا اور بتول کی آواز ریل بن کر اُس کے وجود کے پرخچے اُڑاتے ہوئے اُس پر سے گزر رہی تھی۔

''سازش.....؟ اُس کی ماں یہ سازش کیسے کر سکتی تھی؟''

اُس نے تو صرف ''پیار'' کیا تھا۔ پیار کی یہ سزا تو کوئی اُسے نہیں دے سکتا تھا اور وہ بھی وہ جو اُس کی اپنی ماں تھی۔

کبھی کبھی انسان روشنی میں آنا نہیں چاہتا، کبھی کبھی دُنیا اتنی بدصورت لگتی ہے کہ انسان اُسے دیکھنے کے بجائے اندھا ہو کر جینا چاہتا تھا۔ مراد کے ساتھ بھی اس وقت یہی ہو رہا تھا۔ وہ کس کو بُرا کہے؟ کس سے لڑے؟ کس سے بدلہ لے..... سامنے کھڑے مہرے سے یا اُس مہرے کو چلانے والے اُس ہاتھ سے جس نے مراد کو جنم

دیا تھا۔

''چوہدری صاحب میں.....''

بتول نے بڑی دیر بعد کچھ کہنے کی ہمت کی تھی اور مراد نے ہاتھ اُٹھا کر' جیسے اُسے خاموش ہو جانے کے لیے کہا تھا۔ وہ اب اُس سے کچھ اور بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی وضاحت، کوئی معافی، کچھ بھی نہیں۔ بتول نے اُس کا چہرہ دیکھا پھر پلٹ کر' سکّے چنتی موتیا کو دیکھا اور پھر وہ چپ چاپ اُس دہلیز کی طرف بڑھ گئی تھی جہاں سے مراد ہٹا تھا اور وہ بتول کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھے اُس وجود کو دیکھ رہا تھا جسے اُس نے پہلی نظر میں پہچانا ہی نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی سکّوں کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اُس کے قدموں کی آواز پر اُس نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔ بالکل اُسی طرح جیسے کچھ دیر پہلے وہ بتول کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

وہ کتنے سال بعد ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے..... کتنے سال بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

اُس کے نین غزالی دلبر
اُس کے گال گلابی
اُس کے روپ پہ ساون برسے
بہہ جائے مر مر کے
اُس کا حسن کہانی جیسا
کاغذ کتنے بھر دے
اُس کی مشک بہاروں جیسی
اُس کی چپ میں چھاؤں
وہ حسن پری
وہ روپ متی
وہ میرے جل کی ناؤ

پہلی بار جب مراد نے اُسے دیکھا تھا تو وہ حسن کا مجسمہ تھی اور وہ اُس پر یوں مرمٹا تھا کہ پہلی نظر بھی ہٹا نہیں سکا تھا۔ موتیا نے اُسے باندھ کر رکھ دیا تھا۔ وہ آج اُس سے ملا تھا تو وہ حسن کا مجسمہ بھر بھرا ہو کر اپنی ساری آب و تاب کھو چکا تھا۔ وہ پھر بھی اُس سے نظر نہیں ہٹا پایا وہ آج بھی اُس پر شعر پڑھ سکتا تھا، اُسے آج بھی ٹرین میں سُنا ہوا وہی گیت یاد آیا تھا اور اُس نے عجیب سے انداز میں وہ سب اُس کے سامنے کہنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کی آواز امرت کی طرح موتیا کی سماعتوں میں اُتر رہی تھی جیسے کسی طلسم کو توڑتے ہوئے اُسے پھر سے زندہ کر رہی تھی۔ وہ سب کچھ جو بھول گیا تھا، دوبارہ یاد آنے لگا تھا۔ پھر وہ سب کچھ جو یاد آ رہا تھا وہ جہاں آ کر ختم ہو رہا تھا، وہاں وہ کھڑا تھا۔ غائب نہیں ہوا تھا۔

مراد چند قدم چل کر آگے آیا تھا پھر اُس کے بالمقابل چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ سے سکّے لے کر اُس نے چارپائی پر رکھے تھے۔ اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اُس کا ہاتھ بے حد ٹھنڈا تھا۔ بہت کمزور، اُس کے ہاتھ کی رگیں اُبھری ہوئی تھیں۔ گوشت نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُس کا سرخ و سفید گلابی رنگ اب زرد تھا۔ اُس کے اتنے قریب بیٹھ کر مراد اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکا۔ وہ سر جھکائے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے کسی مجرم کی طرح بیٹھا ہوا تھا اور موتیا پلکیں جھپکائے بغیر اُسے دیکھتی ہی جا رہی تھی۔

''مجھے اتنا برا بھلا کہو موتیا' کہ میں مر جاؤں یہاں بیٹھے بیٹھے۔''

وہ عجیب مطالبہ تھا جو مراد نے بالآخر سر اُٹھا کر اُس سے کیا تھا۔

''میں اب تم سے اپنے لیے کوئی اچھے الفاظ نہیں چاہتا۔ کوئی اظہارِ محبت نہیں، بس تم مجھے بددعائیں دو، بُرا بھلا کہو، گالیاں دو۔ میں سب کچھ سننے آیا ہوں جو اتنے سالوں میں میری بے وفائی پر مجھے کہا ہوگا۔''

مراد نے اُس کو دیکھتے ہوئے کہا تھا اور جواب اللہ وسائی نے دیا تھا' جو ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئی تھی اور دروازے کی طرف مراد کی پشت ہوتے ہوئے بھی وہ پہچان گئی تھی کہ وہ کون تھا' جو موتیا کے سامنے بیٹھا تھا تو موتیا کی آنکھوں میں جیسے چمک لوٹ آئی تھی۔

''جس دن تمہاری بارات ہمارے گھر آنے کے بجائے دروازے کے سامنے سے گزر کر گئی تھی، اس دن کے بعد موتیا نہیں بولی۔ گامو کے مرنے پر بھی نہیں۔ چھوٹے چوہدری! کمی کمین تو ہم تھے پر تم لوگوں نے کیوں بدلہ لینے کے لیے کمیوں سے بھی بدتر کام کیا۔''

اللہ وسائی کی آواز پر وہ جیسے کرنٹ کھا کر پلٹا تھا اور پھر بے اختیار چارپائی سے کھڑا ہو گیا۔

''کس کی بارات؟ میری بارات نے تو یہاں آنا نہیں تھا۔''

''جا کر اپنی ماں سے پوچھ' اپنے باپ سے پوچھ کہ تیری بارات نے اُس دن کہاں جانا تھا اور کہاں گئی؟ تو نے میری بیٹی کو رسوا کرنا تھا تو چھوڑ دیتا، پورے گاؤں کے سامنے یوں بارات لا کر تماشہ نہ بناتا۔ دیکھ اب اس کا حال' یہ نہ ہنستی ہے نہ روتی ہے، نہ بولتی ہے۔ تین سال سے اسی طرح لیے بیٹھی ہوں اسے..... دیکھتے دیکھتے گامو مر گیا۔ اکلوتی جوان بیٹی کا یہ حال ہو جائے تو کون زندہ رہے گا؟ میں بھی زندہ لاش ہوں چھوٹے چوہدری..... صرف اس لیے چل پھر رہی ہوں کیونکہ یہ زندہ ہے، اس کی سانسیں چل رہی ہیں۔ اس نے بددعا نہیں دی کبھی تجھے اور تیرے ماں باپ کو، پر میں ہر روز دیتی ہوں۔ بھٹی پر دانے بھونتے ہوئے میں سارا وقت تجھے بددعائیں دیتی ہوں کہ تیرا خاندان اس طرح اُجڑے کہ لوگ کانوں کو انگلیاں لگا لگا کر توبہ کریں۔''

اللہ وسائی بے حد غم و غصہ میں اُس سے کہتی جا رہی تھی اور مراد دم سادھے سن رہا تھا۔

اولاد کے گناہ ماں باپ کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دیتے ہیں، لیکن ماں باپ کے گناہ بھی اولاد کی جان نکال دیتے ہیں۔

مراد نے ایک لفظ کہے بغیر وہ سب کچھ سن لیا تھا، اُس نے اللہ وسائی کو بولنے دیا تھا، رونے دیا تھا..... وہ سارے جہاں کا کوڑا لا کر اُس پر پھینک دیتی، تب بھی وہ وہاں سے نہ ہلتا۔ لیکن اُس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اُس کی ماں اتنی بے رحم تو کبھی بھی نہیں تھی یا تھی اور اسے ہی اندازہ نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ اُس کی اکلوتی اولاد تھا۔ اُس کے لیے اُس کی ماں کے پاس مٹھاس کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں اور اُس مٹھاس نے اُسے بے یقین کر دیا تھا کہ وہ جو کچھ سن اور دیکھ رہا تھا، وہ تاجور کا کیا دھرا تھا۔ اتنی نفرت، اتنا زہر، اتنی بے رحمی اور اتنی بے حسی..... کس طرح؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھا اور وہ جیسے تڑپ رہا تھا۔

''تو دیکھ! یہ میری بیٹی کس طرح گزارے گی ساری زندگی؟ باپ چلا گیا، میرے بعد کون خیال رکھے گا اس کا؟ لوگ کہتے ہیں یہ پاگل ہو گئی ہے، پر مجھے پتا ہے یہ پاگل نہیں ہے، بس سہہ نہیں سکتی کچھ بھی۔ تو نے توڑ نہیں نبھائی تھی تو کیوں میری بیٹی کو محبت کا فریب دیا تھا؟''

اللہ وسائی روتے ہوئے اُس سے پوچھ رہی تھی اور مراد کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، نہ کوئی وضاحت۔ وہ اللہ وسائی سے یہ کہہ نہیں پا رہا تھا کہ وہ بھی لہولہان تھا۔ اُس کی پشت میں غیروں نے نہیں اُس کی اپنی ماں نے خنجر گھونپا تھا۔

''سنیں چاچی! میں اس جمعے کو بارات لے کر آؤں گا اور موتیا کو بیاہ کر لے جاؤں گا۔ جو کچھ ہوا، اُس پر اپنا

پچھتاوا اور رنج دکھانے کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہیں مگر میں موتیا کو اب لے جاؤں گا، اُسی دھوم دھام سے جس دھوم دھام سے وہ پہلی بار آپ کی گلی سے گزر کر گئی تھی۔''

وہ فیصلہ لمحوں میں ہوا تھا اور اُس سے بھی کم وقت میں مراد نے اللہ وسائی کو سُنا دیا تھا۔ وہ گنگ رہ گئی تھی۔ وہ اس موتیا کو بیاہنے آئے گا، سب کچھ دیکھنے اور جاننے کے بعد بھی۔ اللہ وسائی کو یقین نہیں آیا تھا۔ لیکن کہنے والا اب ایک بار پھر جھک کر موتیا کا ہاتھ پکڑ رہا تھا اور پھر اُس نے اس ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے چھو کر ماتھے پر لگایا تھا۔ پھر وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا اور کچھ بھی کہے بغیر اُن کے گھر سے نکل گیا تھا۔

''مراد.....!''

اللہ وسائی کو لگا اُسے وہم ہوا تھا۔ اُس نے بے یقینی سے موتیا کو دیکھا۔ وہ چارپائی سے اُتر کر کھڑی تھی اور اس دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے وہ نکل کر گیا تھا۔

''اماں مراد.....''

اللہ وسائی نے اُسے ایک بار پھر کہتے سُنا تھا اور اس پر جیسے شادیٔ مرگ طاری ہو گیا تھا۔ آج اتنے سالوں بعد اُس نے موتیا کی آواز سنی تھی۔ دوپٹہ منہ پر رکھے روتے ہوئے اللہ وسائی نے موتیا کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔

''ماں صدقے! ماں واری..... ہاں مراد ہی تھا میری دھی..... تیرے لیے آیا تھا، اب بارات لے کر آئے گا۔''

اُس نے جیسے موتیا کو ساری خوشخبریاں اکٹھی دینا چاہیں۔

''تو بول بات کر موتیا..... تُو کچھ کہہ۔''

اللہ وسائی اُسے کہہ رہی تھی، وہ اللہ وسائی کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اُس نے مدھم آواز میں کہا۔

''ابا!''

اللہ وسائی کے کلیجے پر ہاتھ پڑا۔ روتے ہوئے اُس نے سوچا وہ موتیا کے لیے اب گامو کہاں سے لائے گی۔

''ابا!''

موتیا جیسے ایک بار پھر پکار رہی تھی۔ اللہ وسائی ہنستی اور روتی جا رہی تھی۔ خوشی اور غم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اکٹھے آ گئے تھے اُس کے گھر۔

''تو اتنی جلدی کیوں چلا گیا گامو؟ دیکھ اچھے دن لوٹ کر آئے ہیں ہمارے گھر۔''

اُس نے روتے اور ہنستے ہوئے گامو کو پکارا تھا اور پھر موتیا کو ایک بار پھر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

☆☆☆

مراد موتیا کے گھر سے حویلی نہیں گیا تھا، وہ دوسرے گاؤں اپنے نانا پیر ابراہیم کے پاس گیا تھا اور اُس نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ پیر ابراہیم کی جیسے زبان شل ہو گئی تھی۔ تاجور یہ کیسے کر سکتی تھی، اتنا بڑا گناہ کرنے کے لیے اُس نے ہمت کہاں سے لی تھی۔

''نانا جان! آپ کی بیٹی نے مجھے اور موتیا کو پیار کرنے کی سزا دی اور وہ سزا اتنی بھاری نہیں ہو سکتی تھی۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟ کس سے جا کر اپنی ماں کی شکایت کروں؟ اللہ کے سوا کس کی عدالت میں لے کر جاؤں انہیں سزا دلوانے کے لیے؟ انہوں نے موتیا پر تہمت لگائی۔ میرا دل اُس سے اُٹھا دیا۔ پھر کیا ضروری تھا کہ میری بارات اُس کے گھر کے سامنے سے گزار کر لاتیں اور انہیں اس غلط فہمی میں ڈالتیں کہ وہ اُن کے گھر

بارات لے کر آ رہی ہیں۔'' وہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔

''آپ باپ ہیں اُن کے، میں آپ کے سامنے شکایت لے کر آیا ہوں اُن کی۔ آپ کی بیٹی بہت بے رحم ہیں نانا جان..... بے حد بے رحم ہیں۔''

پیر ابراہیم کو لگا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ سُن کر زمین میں دھنس رہے تھے۔

''تم اُسے معاف کر دو مراد..... میں اُس کی طرف سے تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔''

پیر ابراہیم نے اُس کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا تھا۔ مراد نے اُن کے ہاتھ باندھنے سے پہلے ہی اُن کے ہاتھ کھول دیئے تھے۔

''میں معاف کر ہی دوں گا نانا جان..... میں تو بیٹا ہوں، میرے پاس تو معاف کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ ہی نہیں ہے۔ مگر وہ لوگ اُن کو کبھی معاف نہیں کریں گے جن کی بیٹی کی ایسی حالت کر دی ہے انہوں نے۔''

''میں نے پہلے بھی موتیا سے معافی مانگی تھی، میں ایک بار پھر اُس کے گھر جا کر معافی مانگوں گا اُس سے مراد!''

پیر ابراہیم نے اُس سے کہا تھا اور اُس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''نہیں نانا جان! اب معافیوں سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں موتیا سے شادی کرنے جا رہا ہوں اس جمعے کو۔ آپ نکاح پڑھائیں گے تو مجھے خوشی ہوگی..... نہیں پڑھائیں گے تو بھی میں نہیں رُکوں گا۔''

وہ جیسے اعلان کرنے والے انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پیر ابراہیم اُسے دیکھتے رہے پھر اُنہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے مراد! جو تمہارا فیصلہ وہی میرا..... مگر ماہ نور کو کوئی سزا مت دینا، اُس کے ساتھ انصاف کرنا۔''

مراد اُنہیں دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔

''میں موتیا کو اپنے پاس لندن میں رکھوں گا۔ اُسے ابھی علاج کی ضرورت ہے۔ ماہ نور گاؤں میں ہی رہے گی۔ آتا جاتا رہوں گا۔ کوشش کروں گا انصاف کروں، لیکن اگر نہ ہو سکا تو مجھے معاف کر دیں۔ آپ لوگ ماہ نور کو میری زندگی میں نہ لاتے تو وہ خوش ہوتی آج کہیں اور۔''

وہ جیسے اپنا فیصلہ سُنا کر اُن سے مل کر وہاں سے چلا گیا تھا اور پیر ابراہیم کو سوچوں میں ڈال گیا تھا۔ اُنہیں یوں لگ رہا تھا' اُن کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تسبیح میں سے آگ نکل رہی تھی۔ وہ دانے اپنی آگ اُن کے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے جیسے اُنہیں آنے والے طوفانوں سے خبردار کر رہے تھے۔ کوئی چیز اُن کے دل کو مٹھی میں لے رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کون سی انہونی تھی جس کی خبر اُن تک آ رہی تھی، پر کیا ہونے والا تھا وہ اُس سے بے خبر تھے۔

☆☆☆

''یہ تو نے کیا کیا بتول؟''

شکوراں دنگ بیٹی کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس نے موتیا کے گھر سے آتے ہی ماں کو سب کچھ بتا دیا تھا یوں جیسے اپنے ضمیر سے بوجھ اُتار پھینکنے کی کوشش کی ہو۔

''اماں سعید کے لیے کیا جو بھی کیا..... یہ نہیں پتا تھا کہ موتیا پاگل ہو جائے گی..... یہ بھی نہیں پتا تھا کہ چوہدرائن یہ سب کریں گی اُس کے ساتھ ورنہ سوچ لیتی۔''

وہ اپنے ہاتھ مسلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ شکوراں نے سینہ پیٹنے والے انداز میں ہاتھ سینے پر مارتے ہوئے کہا۔

''اتنا بڑا گناہ کمایا! تجھے حوصلہ کیسے ہوا یہ سب کرنے کا؟''

''پیار میں مجبور ہوگئی تھی اماں!..... یہ نہ کرتی تو داج نہ ملتا..... داج نہ ملتا تو سعید نہ ملتا۔''
بتول ماں سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔
''تیری بچپن کی سہیلی تھی بتول!..... تو نے رول دیا اُسے اپنے پیار میں..... ہائے ہائے تو نے ماں کو بھی گناہ گار کر دیا اپنے ساتھ۔''
شکوراں اب اپنے گال پیٹ رہی تھی۔
''تین سال سے تڑپ رہی ہوں اماں!..... قسم لے لے جو ایک دن بھی چین کی نیند سوئی ہوں۔ کانٹوں پر لوٹتی ہوں ہر رات، میں نے سوچا ہی نہیں تھا موتیا اور اُس کا خاندان اِس طرح رُل جائیں گے۔ اماں' جو قسم چاہے لے لے پر میری بات کا یقین کر لے۔ میں نے نہیں سوچا تھا کہ موتیا کا یہ حال ہو جائے گا۔''
وہ روتی جا رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی۔
''تو نے چوہدری مراد کے سامنے کہا ہے یہ سب کچھ..... چوہدرائن نے کل میری گردن اُتار دینی ہے اور تیری بھی۔ میں تجھے بتا رہی ہوں۔''
شکوراں بے حد پریشان تھی۔
''اماں کاٹ دے اب وہ میری گردن مجھے پروا نہیں۔ یہ اولاد ہونے والی ہے تو مجھے اپنے گناہ کے بوجھ کا احساس ہونے لگا ہے۔ اپنے انجام سے کبھی خوف نہیں آیا، پر اس بات سے خوف آنے لگا ہے کہ کہیں میرا گناہ وبال کی صورت میری اولاد کے گلے نہ پڑ جائے۔ کتنی بار میری کوکھ ہری ہو کر اُجڑی ہے۔ ہر بار اُجڑنے پر مجھے موتیا یاد آئی۔ تجھے پتا نہیں آج کتنی سکھی ہو کر یہاں بیٹھی ہوں۔ اب چاہے کوئی پھانسی لگا دے چاہے گردن کاٹ دے، پر بتول نے جھوٹ کا بوجھ نہیں اُٹھانا۔ میری اب بس ہو گئی ہے۔''
بتول عجیب تھکن زدہ انداز میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی، اور شکوراں بس دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو صاف کرتی جا رہی تھی۔ وہ اب اس حالت میں اسے اور بُرا بھلا کیا کہتی پر اُس رات شکوراں کو نیند نہ آئی۔ اللہ دہائی کی بددعائیں اُس کے کانوں میں گونجتی رہیں اور یہ سوچ سوچ کر اُس کا کلیجہ منہ کو آتا رہا کہ یہ خود اُس کی اپنی نسل، اپنی بیٹی بتول تھی جس کے لیے وہ اُجڑ جانے کی بددعائیں کر رہی تھی اور جس کی اگلی نسل کا وہ خاتمہ دیکھنا چاہتی تھی۔
اُس نے اُس رات اُٹھ اُٹھ کر گھڑے سے پانی پیا تھا، پر پتا نہیں زبان پر کانٹے بڑھتے ہی کیوں گئے تھے۔ گلا خشک کیوں ہو گیا تھا۔

☆☆☆

تاجور بے قراری سے حویلی کے برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ چوہدری شجاع اُس سے بھی زیادہ بے چین حویلی کے بڑے دروازے پر کھڑا کھڑا تھک گیا اور کچھ دیر کے لیے واپس اندر آیا۔
''چوہدری صاحب! آ گیا مراد؟''
چوہدری شجاع کے ساتھ مراد کو نہ دیکھنے کے باوجود تاجور پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔
''نہیں ابھی تک نہیں آیا، مجھے تو فکر ہونے لگی ہے۔ گاڑی تو چلا لیتا ہے' شیدا پر پتا نہیں آج کیوں اتنی دیر کر دی ہے۔ گاؤں کی سڑک بھی بڑی کچی پکی ہے۔''
وہ جیسے خود کو خود ہی تسلیاں دے رہا تھا۔
''اس سے جلدی تو وہ تانگے پر آ جایا کرتا تھا چوہدری صاحب..... آپ کی گاڑی تو تانگے سے بھی گئی گزری نکلی۔''

تاجور نے چوہدری شجاع کی نئے ماڈل کی کرولا کو بھی رگڑ کر رکھ دیا۔

''دیکھتا ہوں میں یا پھر بھیجتا ہوں کسی کو اسٹیشن دیکھ کر تو آئے۔ کہیں ٹرین کو تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گیا۔''

چوہدری شجاع کو اچانک فکر ہونے لگی اور اِس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، باہر ہارن کی آواز آنے لگی تھی۔ تاجور کا چہرہ کھل اُٹھا۔ چوہدری شجاع باہر کی طرف لپکا تھا۔ تاجور وہیں کھڑی کھڑی ماہ نور کو آواز دے کر بلانے لگی۔

مراد ٹھیک نہیں تھا۔ یہ احساس چوہدری شجاع کو مراد کو گاڑی سے نکلتے دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر کچھ تھا جس نے چوہدری شجاع کو عجیب سے انداز میں ہولایا تھا۔ لپکتے ہوئے اُس نے مراد کو سینے سے لگایا تھا۔

''آ گیا میرا پتر! تجھے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔''

چوہدری شجاع نے اُسے تھپکا تھا اور اُسے تھپکتے ہوئے اُسے مراد کا وجود لرزتا محسوس ہوا۔ وہ باپ کے سینے سے لپٹا ہوا یک دم رونے لگا تھا۔ اندر سامان لے کر جاتے ہوئے ملازموں نے اُسے گھر آنے کی خوشی سمجھ کر ان آنسوؤں کو نظر انداز کیا تھا، مگر چوہدری شجاع باپ تھا اُس نے مراد کو پالا تھا وہ اِن سسکیوں میں چھپی آہوں کو سن پا رہا تھا۔

''کیا ہوا مراد! تو ٹھیک تو ہے پتر؟''

اُس نے اُسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''ابا! میں موتیا سے مل کر آیا ہوں۔ ظلم کیا ہے آپ دونوں نے۔ کوئی کسی جیتے جاگتے انسان کے ساتھ یہ کیسے کر سکتا ہے؟''

وہ اب چوہدری شجاع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔

''تجھے کسی نے غلط بتایا ہے مراد.....''

چوہدری شجاع نے جیسے تاجور پر پردہ ڈالنا چاہا۔

''مجھے کسی نے کچھ غلط نہیں بتایا ابا! مجھے اُس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے جس کو استعمال کر کے میری اپنی ماں نے میری نظروں میں موتیا کو بدکردار ثابت کیا تھا۔''

چوہدری شجاع کچھ نہیں سمجھا تھا۔

''تو کیا کہہ رہا ہے مراد؟ تیری ماں کیوں کرے گی ایسی سازش؟''

اُس نے بیوی کا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔

''انہوں نے کی ہے سازش..... اگر آپ اس میں شریک نہیں ہیں تو جا کر پوچھیں اُن سے اُنہوں نے اُس رات بتول کو کہہ کر اُس کے منگیتر اور موتیا کو کنویں پر اکٹھا کیوں کیا تھا اور پھر مجھے جگا کر اُن دونوں کو اکٹھا دیکھنے کیوں بھیجا تھا؟ آپ کی ضد میں، میں اور موتیا مارے گئے ابا۔''

وہ اب قمیص کی آستین سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ چوہدری شجاع کو کوئی جواب نہیں سوجھا تھا۔ وہ تاجور کی طرف داری کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اُس پر پردہ ڈالتے ڈالتے بھی تھک گیا تھا۔ وہ خامیوں اور عیبوں پر پردہ ڈال سکتا تھا پر اُس کے گناہوں پر کیسے پردہ ڈال سکتا تھا۔ وہ تو اللہ اور بندے کا معاملہ تھا۔

مراد رُکے بغیر اندر آیا تھا اور اُس نے تاجور اور تاجور کے پیچھے کھڑی ماہ نور کو بیک وقت دیکھا تھا۔ تاجور بازو پھیلائے آگے بڑھی تھی پر مراد اُس کے بازوؤں میں آنے کے بجائے چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ تاجور کو جیسے ٹھوکر لگی اور وہ رُک گئی، وہ اُسے جس طرح دیکھ رہا تھا اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تاجور اُس سے نظریں نہیں ملا سکی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب وحشت تھی۔ تاجور نے عقب میں آتے چوہدری شجاع کو دیکھا اُس کی آنکھیں

بھی اتنی ہی کٹھور تھیں۔

''میں تیرا انتظار کر رہی تھی۔ تو کدھر رہ گیا تھا؟''

تاجور نے جیسے اپنے ان احساسات کو وہم سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

''میں اُس جہنم سے ہو کر آیا ہوں جس میں آپ نے موتیا اور اس کے گھر والوں کو پھینکا تھا امّی۔''

اُس کے جملے نے تاجور کو کسی رسّی سے باندھ دیا۔ وہم بھی کبھی بلاؤں میں بدل جاتے ہیں۔ تاجور کو بھی اس لمحے ایسا ہی لگا تھا۔ وہ اتنے مہینے بعد آ کر اُس کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور ماں کے بجائے موتیا کی بات کر رہا تھا، ایک بار پھر موتیا..... ایک بار پھر وہی۔

''یوں مت دیکھ مجھے مراد!..... ماں ہوں میں تیری۔''

تاجور تڑپی تھی۔ اُس کی آنکھیں برچھی بن کر اُسے کاٹ رہی تھیں۔

''اس ہی لیے تو دیکھ رہا ہوں آپ کو ماں ہو کر اتنا زہر کیسے اکٹھا کر لیا آپ نے اپنے اندر۔''

مراد نے کہا تھا۔ تاجور کو اپنے عقب میں کھڑی ماہ نور کے سامنے عجیب سی ہتک محسوس ہوئی، جو اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں نے جو بھی کیا، تیری اور اس خاندان کی بھلائی کے لیے کیا۔''

تاجور نے لمحے لگائے تھے یہ فیصلہ کرنے میں کہ وہ کسی بات سے اب نہیں مکرے گی، کیونکہ اُن کو جو پتا چلنا تھا چل چکا تھا۔

''کسی کو زندہ درگور کر کے کسی کو پھانسی پر چڑھا دینے کو آپ بھلائی کہتی ہیں؟''

مراد نے بے حد طیش میں ماں سے کہا تھا۔ تاجور کی ڈھٹائی اور خود غرضی اُس کے بیٹے کو برہم کر رہی تھی۔ کہیں نہ کہیں اُسے یہ توقع تھی کہ ماں شرمسار ہو جائے گی یہ سب کچھ سامنے آ جانے پر، لیکن وہ تاجور کو نہیں جانتا تھا۔

''اتنی اونچی آواز میں بات نہ کر مجھ سے مراد! تو حویلی کے نوکروں کے سامنے میرا تماشا بنا رہا ہے۔''

تاجور کو اُس کے لب و لہجہ سے اب ہتک کا احساس ہونے لگا تھا۔

''آپ نے پورے گاؤں کے سامنے موتیا اور اُس کے ماں باپ کا تماشا بنایا، تب آپ کو احساس نہیں ہوا تھا کہ اُن کی بھی عزت تھی۔''

مراد نے آواز نیچی کیے بغیر کہا تھا۔ تاجور نے سُرخ چہرے کے ساتھ شوہر کو دیکھا، جس کے تاثرات نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ بیٹے کو روکنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

''کیا چاہتا ہے تو یہ سب کچھ مجھے بتا کر؟ تو چاہتا ہے کہ میں موتیا کے گھر معافی مانگنے جاؤں؟''

وہ بالآخر برہم انداز میں اُس سے مخاطب ہوئی تھی۔

''نہیں اب آپ معافی مانگنے نہیں جائیں گی۔ اب آپ وہاں میری بارات لے کر جائیں گی۔ معافی کا وقت تو کب کا گزر گیا۔''

مراد نے کہا تھا اور تاجور اور ماہ نور پر جیسے بجلی گراتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔

''آپ نے سُنا چوہدری صاحب، یہ کیا کہہ کر گیا ہے؟ میری بھتیجی پر سوکن لائے گا۔''

تاجور، چوہدری شجاع پر اُلٹ پڑی تھی۔

''پیر صاحب سے اجازت لے کر آیا ہے وہ۔ وہی نکاح پڑھائیں گے موتیا کا اور اُس کا۔''

چوہدری شجاع نے بے حد مختصر جواب دیا تھا اور وہ بھی رُکے بغیر وہاں سے چلا گیا تھا۔ تاجور کو جیسے اس کی

بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر جاتے ہوئے شوہر کو بے یقینی سے دیکھا تھا اور پھر برآمدے میں کھڑی زرد ہوتی ہوئی ماہ نور کو جو یوں لگتا تھا کہ ابھی گری کہ تبھی گری۔

''پھوپھو! دادا تو یہ کیسے کر سکتے ہیں؟''

تاجور نے ماہ نور کو کہتے سنا تھا۔

''اس گھر میں تیرے علاوہ کسی کی ڈولی نہیں آئے گی ماہ نور! میں دیکھوں گی بابا جان بھی کیسے اُسے یہ کام کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں؟ چوہدریوں کا شملہ اب کمیوں کی ڈوری سے بندھے گا؟''

وہ بے حد رعونت سے کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھی۔

ماہ نور برآمدے کی دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اُس نے آج کے دن کے لیے خاص طور پر جوڑا سلوایا تھا۔ کئی گھنٹے لگا کر خود کو ایک بار پھر سجایا تھا..... کہ شاید آج اُس کو دیکھ کر وہ موتیا کو بھول جائے، اُس کے بچے اُسے موتیا کو بھلا دیں۔ پر مراد نے اُسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ موتیا کا نام لیتے ہوئے آیا تھا، اور موتیا کا نام لیتے ہوئے ہی چلا گیا تھا۔ اُس کی زندگی میں جیسے ماہ نور تھی ہی نہیں۔

''مجھے پتا ہوتا پھوپھو! کہ مراد کا نام ساتھ لگانے کی خواہش مجھے یہاں تک لے آئے گی تو میں کبھی مراد کی زندگی میں نہ آتی۔ وہ موتیا کا ہوتا یا نہ ہوتا، پر کم از کم میں تو کسی قدر کرنے والے کی ساتھی ہوتی۔ آپ کی ضد نے اُن دونوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی خوار کر دیا۔''

وہ جو کچھ وہاں کھڑے کھڑے سوچ رہی تھی، وہ تاجور سے کہنے کی ہمت اُس میں کبھی نہیں آسکتی تھی۔ تاجور نے کون سی سازش کی تھی؟ کیسے موتیا کو مراد سے الگ کیا تھا؟ کیسے اُسے گاؤں میں ذلیل کیا تھا؟ ماہ نور اب بھی ان ساری چیزوں کے مکمل حقائق نہیں جانتی تھی۔ اور وہ جاننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی زندگی کا گڑھا اتنا گہرا ہوتا جا رہا تھا کہ اُسے یہ پروا ہی نہیں تھی کہ کوئی دوسرا کتنے گہرے گڑھے میں جا گرا تھا۔

☆☆☆

مٹی سے اٹے اُس صندوق کو کھول کر اللہ وسائی نے اُس رات سالوں بعد وہ جوڑا نکالا تھا جو اُس نے موتیا کی شادی کے لیے بنایا تھا اور اُس ہی صندوق میں موتیا کے جہیز کے سارے کپڑے تھے جو اللہ وسائی پتا نہیں کتنے سالوں سے کاڑھتی اور اکٹھی کرتی آئی تھی۔ اُس نے وہ لال دوپٹہ نکال کر بہتے آنسوؤں کے ساتھ ایک بار پھر موتیا کے سر پر ڈالا تھا۔ موتیا ہنسی تھی۔

''اماں!''

اُس نے کہا تھا اور اللہ وسائی جیسے نہال ہوگئی تھی۔

''ماں صدقے! ماں واری!''

موتیا کی آواز جیسے اُس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ وہ صرف چند ہی لفظ تھے جو موتیا بول رہی تھی، مگر وہ چند لفظ بھی اللہ وسائی پر شادیٔ مرگ طاری کرنے کے لیے کافی تھے۔ اُس نے شام ہی کو پورے گاؤں میں میٹھے چاول بنا کر بانٹے تھے، موتیا کے بولنے کا اعلان کرنے اور گاؤں والے جیسے جوق در جوق اُس کے گھر موتیا کو دوبارہ باتیں کرتا دیکھنے کے لیے آتے تھے پر اللہ وسائی نے موتیا کو کسی کے سامنے نہیں آنے دیا۔ وہ بُری نظر سے ڈرتی تھی۔ پہلے بھی اُسے لگتا تھا موتیا کو کسی کی بُری نظر ہی لگی تھی۔ اور وہ یہ سب دوبارہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اُسے اب بھی مراد کے وعدوں پر یقین نہیں تھا۔ پر وہ پھر بھی اُس صندوق کو کھولنے سے اپنے آپ کو روک نہیں پائی تھی۔

اُس لال دوپٹے نے آج بھی موتیا کو عجیب ہی روپ دیا تھا۔ اللہ وسائی اُس سے نظریں ہی نہیں ہٹا پائی۔

اُس نے کتنے عرصے بعد موتیا کو ہنستے دیکھا تھا۔ اُسے گامو یاد آیا تھا، وہ ہوتا تو..... اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جیسے اُس آہ کو روکا تھا جو اُس کے خیال پر پتا نہیں دل کے کس حصے سے نکلی تھی۔

موتیا اُس ہی طرح دوپٹہ اوڑھے بیٹھی تھی، اللہ وسائی اُٹھ کر چھت پر سے وہ ڈھولک بھی اُتار لائی جو وہ موتیا کی شادی پر لائی تھی اور پھر اُسے بجا نہیں پائی۔ ڈھولک کی رسی کستے ہوئے اُس نے موتیا کے سامنے بیٹھ کر ڈھولک بجانا شروع کیا۔

کنڈا لگ گیا تھالی نوں
ہتھاں وچ مہندی لگ گئی
اک قسمت والی نوں

موتیا چمکتے چہرے کے ساتھ بیٹھی اللہ وسائی کا ٹپہ سنتی رہی اور پھر اُس نے اٹک اٹک کر ساتھ گانا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے گانے پر اللہ وسائی نے ڈھولک کی تھاپ تیز کر دی۔

اُس رات اُس گھر سے آنے والی ڈھولک کی آواز اور اللہ وسائی کا گیت آس پاس کے بہت سے گھروں میں لوگوں نے سُنا تھا۔ اور اُس دن بہت سے لوگوں نے چوہدری مراد کو اُن کی گلی اور گھر میں آتے جاتے بھی دیکھا تھا۔ سرگوشیاں اور چہ مگوئیاں شروع ہو گئی تھیں، پر اُن سرگوشیوں اور چہ مگوئیوں میں بھی موتیا اور اللہ وسائی کے لیے خوشی ہی تھی۔

☆☆☆

وہ رات حویلی پر بڑی بھاری تھی یا شاید یہ کہنا زیادہ آسان تھا کہ تاجور اور ماہ نور پر بھاری تھی۔ مراد تو اُس سے بھی زیادہ مشکل راتیں گزار چکا تھا۔

چوہدری شجاع نے تاجور کو کمرے میں چکر کاٹتے دیکھ کر بھی اُسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ اُس کی وجہ سے بیٹے کی نظروں میں چور بن گیا تھا اور دُنیا کی نظروں میں ظالم۔ تاجور کو لگا تھا موتیا نے اُس کی بساط اُس وقت اُلٹی تھی جب وہ جیت اُس سے بال برابر دور تھی اور تاجور یہ ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔ اس حویلی میں موتیا کے آنے سے بڑا غم یہ تھا کہ اُس کا اپنا باپ اُس کے بیٹے کا نکاح پڑھوا کر یہ کام کرنے والا تھا۔ تاجور نے خواہش کی تھی گامو کے ساتھ ساتھ موتیا بھی مر جاتی تو یہ سارا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا۔ بے چین چلتے چلتے اُسے خیال آیا تھا اور اُس خیال نے اُس کے قدم روک لئے تھے۔

''ہاں موتیا بھی مر جائے تو سارا مسئلہ ہی ختم ہو جائے!''

عجیب انداز میں اُس نے سوچا تھا۔ یہ کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں تھا۔ ہاں یہ کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں تھا۔ اُس نے سوئے ہوئے چوہدری شجاع کو دیکھا۔ دور کہیں گاؤں میں کتے بھونک رہے تھے اور حویلی کے اندر تاجور اُن کی آواز بغور سنتے ہوئے جیسے اپنا لائحہ عمل طے کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ رات تاجور کی طرح ماہ نور پر بھی بڑی بھاری تھی۔ وہ پچھلے پہر سے شام تک کچھ کھائے پیے بغیر بچوں کو سنبھالتی مراد کا انتظار کرتی رہی، جو تاجور سے ہونے والے جھگڑے کے بعد ایک بار پھر باہر چلا گیا تھا اور پھر رات کو دیر سے واپس آیا تھا۔

''کھانا کھائیں گے؟'' ماہ نور نے اُس سے پوچھا تھا۔

''نہیں۔''

مراد نے جواب دیا اور کپڑے بدلنے چلا گیا تھا۔ ماہ نور اُس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ غسل

خانے سے باہر آ گیا تو ماہ نور نے اُس سے کہا۔
''آپ کے لیے پتا نہیں کیا کیا بنایا تھا۔ پتا ہوتا کہ آپ کھانا ہی نہیں کھائیں گے تو میں کچھ بھی نہ بناتی۔''
اُس نے عجیب سے انداز میں اُس سے کہا تھا۔
''حویلی میں بہت کھانے والے ہیں.....اور کوئی نہیں تو ملازم کھالیں گے۔''
مراد نے اپنی آستینیں تہہ کرتے ہوئے کہا تھا۔
''میں نے ملازموں کے لیے تو اتنی محنت نہیں کی تھی۔''
ماہ نور نے کہا۔ مراد نے اُسے سر اُٹھا کر دیکھا پھر کچھ بھی کہے بغیر اُس کے قریب صوفہ پر آ کر بیٹھ گیا۔
''ماہ نور! میں تم سے کوئی چیز نہیں چھینوں گا۔ اپنی ساری جائیداد تمہارے بچوں کے نام ہی رہے گی۔ میں موتیا کو اس حویلی میں بھی نہیں رکھوں گا۔ میں تمہیں تمہارے کسی حق سے بھی محروم نہیں رکھوں گا۔ میں جانتا ہوں تم سے ایک بڑی قربانی مانگ رہا ہوں لیکن میرے پاس اِس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اُس کی اور اُس کے خاندان کی زندگی میری وجہ سے برباد ہوئی ہے۔ میرے علاوہ کوئی اور یہ تباہی نہیں روک سکتا۔''
زندگی میں پہلی بار وہ ماہ نور سے دل کی بات کر رہا تھا۔ کسی غم خوار، غم گسار کی طرح وہ اُس کی باتیں سنتے ہوئے اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ شخص کس دوراہے پر اُسے کھڑا کر کے اُس سے دل کی بات کر رہا تھا۔ چند دنوں میں وہ اُس کا ہونے جا رہا تھا، جس کا وہ ہمیشہ سے تھا اور وہ اپنے دو بیٹوں کے ساتھ اُس سے یہ سن رہی تھی کہ وہ دُنیا اُسے دے کر دل کسی اور کو دے دینا چاہتا تھا اور اُس کا خیال تھا وہ دنیا لے کر راضی ہو جائے گی۔
''موتیا میں ایسا کیا ہے مُراد! جو مجھ میں نہیں؟ جو انگلینڈ کی کسی اور عورت میں بھی نہیں کہ آپ اُس سے وہاں بے وفائی کر لیتے۔''
اُس نے عجیب سے انداز میں اُس سے کہا تھا۔
''میں نے اُس سے وفا کی کب ہے کہ بے وفائی کا سوچتا؟ میں تو جھوٹا اور کھوٹا ثابت ہوا پیار کے ہر امتحان میں۔'' مراد نے اُسے کہا تھا۔
''یہ سب کچھ اُسے دے دیں۔ یہ ساری جائیداد اُس کے نام لگا دیں اور مجھے اپنا آپ دے دیں مراد۔''
وہ بلکی تھی۔ مراد اُسے دیکھتا رہا، پھر اُس نے ماہ نور کو جھکتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیا۔
''میں ایک کا مجرم ہوں۔ تم بھی گناہ گار سمجھ کر بات کرو گی مجھ سے تو میں پریشان رہوں گا۔ تم مجھ سے طلاق چاہو گی، میں تب بھی تیار ہوں۔ ساتھ رہنا چاہو گی تو بھی بڑی عزت سے رکھوں گا۔''
وہ کہتا گیا۔
''صرف عزت سے.....محبت سے نہیں؟''
ماہ نور نے اُس کی بات کاٹی تھی، وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔
''محبت مجھے کرنی نہیں آئی ماہ نور!.....آتی تو نہ میں موتیا پر شک کر کے اُس کے کردار پر سوال اُٹھاتا نہ تم کو اپنی زندگی میں لاتا۔''
اُس کی آواز میں عجیب توڑ پھوڑ تھی۔ ایک لمحے کے لیے ماہ نور کا دل چاہا، وہ اُسے خوشی خوشی موتیا کو اپنی زندگی میں لے آنے کی اجازت دے دے۔ اُسے کہے کہ وہ لائے اُس عورت کو اپنی زندگی میں جس سے کی جانے والی بے وفائی نے اُسے یوں توڑ پھوڑ دیا تھا۔ پر وہ تاجور کی بھتیجی تھی۔ اتنی آسانی سے اُسے جھکنا اور ہار مان لینا آتا ہی نہیں تھا۔ وہ جنگ اگر اس کے لیے اُس کی پھوپھو لڑ رہی تھی تو اُسے اُن کے ساتھ کھڑے ہونا تھا، اُسے مراد کو اتنی آسانی سے موتیا کا نہیں ہونے دینا تھا کہ اس کمرے کے علاوہ اُس کے وجود میں سے بھی موتیا کی خوشبو

نے لگے۔ اُس کے سینے سے لگی ہوئی وہ جیسے یہ فیصلہ کر رہی تھی کہ اُسے وہ سب کچھ کرنا تھا جو تاجور چاہتی تھی اور جو مراد کو موتیا کا نہ ہونے دیتا۔ اُسے یہ پتا نہیں تھا کہ وہ ساری عمر اپنے اس فیصلے پر پچھتانے والی تھی۔

☆☆☆

''اب اُس کے سامنے نہ آنا تاجور..... اب اُسے کر لینے دے وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے۔''

پیر ابراہیم نے تاجور کے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ وہ ماہ نور کو لیے اُن کے کمرے میں آئی تھی اور سلام کر کے بیٹھی تھی۔ پر اُس کے بات شروع کرنے سے بھی پہلے پیر ابراہیم نے بات ختم کر دی تھی۔ وہ اُن کی بیٹی نہ ہوتی تو وہ تاجور کی شکل دیکھنا بھی نہ چاہتے۔

''یہ پوتی ہے آپ کی..... اسے دیکھیں بابا جان..... اس کا گھر تڑوا رہے ہیں آپ..... اس پر ایک کمی کو بیاہ کرلانے کی اجازت دے رہے ہیں مراد کو۔''

تاجور ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کھینچ کر اُن کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ پیر ابراہیم نے ماہ نور کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا اور تاجور سے کہا۔

''ہر بار تیری زبان سے کمی کا لفظ تجھے میری نظروں میں چھوٹا کر دیتا ہے تو سوچ تاجور! تو رب کی نظروں سے کتنا گر جاتی ہوگی۔''

تاجور ایک لمحہ کے لیے ساکت ہوئی۔ بہو کے سامنے اُسے اپنے باپ کے منہ سے یہ جملہ تیر کی طرح لگا تھا۔

''رب نے اُن سے برتر بنا کر اُتارا ہے ہمیں..... اُن کا حاکم بنایا..... دانے والا بنایا۔''

وہ بے حد ناراضی سے کہتی گئی۔

''دکھا مجھے وہ کتاب جس میں لکھا ہے کہ رب نے تجھے برتر بنا کر اُتارا ہے..... تجھے حاکم بنا دیا تو تُو نے سب کو غلام سمجھ لیا..... دانے والا بنایا ہے نا تو ایک دانہ اُگا کر دکھا جھوک جیون کے کھیتوں میں۔ ترس رہی ہے نا تو پانی کے لیے۔ شجاع کہتا ہے سمجھ میں نہیں آتا نہر سے بھی پانی فصلوں تک نہیں پہنچتا، زمین پہلے ہی نہر کا پانی پی جاتی ہے۔ جس زمین پر لوگوں کے ساتھ دانے والے ظلم کرنا شروع کر دیں، وہ بستیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ تو اب توبہ کیا کر صرف توبہ تاجور! تو بڑا ظلم کر بیٹھی ہے اپنے آپ پر۔''

پیر ابراہیم کو تاجور نے زندگی میں پہلی بار اتنے غصہ میں دیکھا تھا اور وہ بلند آواز میں بات کرنا شروع ہوئے تھے تو تاجور بولنا ہی بھول گئی۔

''بس اب تو چلی جا یہاں سے! صرف شادی کی تیاری کر۔ جا کر موتیا کو کپڑے اور زیور دے کر آ۔ اُس کا قدم حویلی میں پڑے گا تو سوکھا ختم ہو جائے گا۔''

تاجور کو لگا پیر ابراہیم نے یہ سب کہہ کر اُسے ماہ نور کے سامنے دو کوڑی کا کر دیا تھا اور ماہ نور کو لگا تھا اُس کے دادا نے اُس کی پرواہ ہی نہیں کی۔ اتنی آسانی سے کسی اور کو مراد کی زندگی میں اُس کے برابر جگہ دے دی۔

وہ دونوں خاموشی سے سینے کے اندر بھانبھڑ لے کر نکلی تھیں۔

''پھوپھو! دیکھ لیا آپ نے؟ کچھ بھی نہیں کیا دادا جان نے اور اگر وہ یہ سب کہہ رہے ہیں تو میرے ابو اور امی نے کچھ نہیں کرنا میرے لیے۔ میں کیا کروں؟''

ماہ نور نے کمرے سے باہر آ کر روتے ہوئے تاجور سے کہا۔

''جب تک میں ہوں نا تیری آنکھوں میں آنسو نہ آئیں ماہ نور! نہیں آئے گی موتیا حویلی میں۔''

تاجور نے بے حد عجیب لہجہ میں جیسے دوٹوک انداز میں اُس سے کہا تھا۔

''بس تجھے ساتھ دینا ہے میرا۔''
''پھوپھو! میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ بتائیں کیا کرنا ہے؟''
ماہ نور نے جیسے سارے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اللہ وسائی کو اپنا گھر دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مراد نے حویلی کے کچھ ملازم بھیجے تھے جنہوں نے دو دن میں اللہ وسائی کے گھر میں ہونے والی ساری ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کر دی تھی۔ بیرونی دروازہ مرمت ہونے کے بعد اب نئے سرے سے بند ہونے کے قابل ہو گیا تھا۔ فرش لیپا جا چکا تھا اور در و دیوار پر سفیدی بھی ہو گئی تھی۔ جو چھوٹی موٹی مرمتیں اور ہونے والی تھیں، وہ بھی ہو چکی تھیں اور اب جیسے وہ گھر شادی والا گھر کہلانے کے قابل ہو گیا تھا۔

مراد اُن ہی کاموں کو دیکھنے کے لیے اللہ وسائی کے گھر ایک بار پھر آیا تھا، اور اللہ وسائی نے جیسے قربان جانے والے انداز میں اُس کا استقبال کیا تھا۔ اُسے جیسے پہلی بار صحیح معنوں میں یہ یقین آ گیا تھا کہ وہ موتیا کی بارات لے کر آئے گا۔

''ابا رشتہ مانگنے آئیں گے کل اور ساتھ موتیا کے لیے کچھ کپڑے اور زیور بھی لے کر آئیں گے۔''
مراد نے اللہ وسائی کو اطلاع دی تھی، اللہ وسائی کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔
''زیور کپڑے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے چھوٹے چوہدری جی! وہ رشتہ مانگنے آ جائیں..... اتنا ہی کافی ہے۔''
اللہ وسائی نے جواباً کہا تھا۔
''وہ آئیں گے اور پورے گاؤں والوں کے سامنے آئیں گے۔''
مراد نے جواباً اُس سے کہا تھا۔
''موتیا کہاں ہے؟''
اُس نے اللہ وسائی سے پوچھا تھا۔
''کمرے میں سو رہی ہے۔ میں جگاتی ہوں۔'' اللہ وسائی نے کہا۔
''نہیں چاچی! جگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس ایک نظر اُسے دیکھنا چاہتا ہوں..... پھر چلا جاؤں گا۔''

مراد نے اجازت طلب نظروں سے اللہ وسائی کو دیکھا۔ اللہ وسائی نے سر ہلا دیا۔
مراد اُٹھ کر اُس کمرے کی طرف چلا گیا جس طرف اللہ وسائی نے اشارہ کیا تھا۔ وہ چارپائی پر کروٹ لیے ہوئے سو رہی تھی۔ وہ دبے قدموں اُس کے پاس چلا گیا۔ اُس کے سرہانے کی طرف زمین پر پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہ گہری نیند میں تھی اور یہ چہرہ وہ چہرہ ہی نہیں تھا جس پر وہ پہلی نظر میں مرمٹا تھا۔ اُس چہرے پر نیند میں بھی ہزار داستانیں پڑھی اور لکھی جا سکتی تھیں اور اُن میں سے کوئی بھی داستان آنسوؤں کے بغیر نامکمل ہوتی۔
وہ اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اتنا قریب سے اُسے وہ چہرہ پہلی بار دیکھنے کا موقع مل رہا تھا، ورنہ اِس سے پہلے تو وہ ہمیشہ اُس کی آنکھوں میں ہی اُلجھ کر رہ جاتا تھا۔ وہ آنکھیں اُسے کہیں اور جانے ہی نہیں دیتی تھیں۔ اپنی انگلیوں کی نرم پوروں سے اُس نے موتیا کے ماتھے کو چھوا تھا، پھر اُس کے گالوں کو پھر اُس کی ٹھوڑی کو پھر اُن بالوں کو جو اُس کے چہرے کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے۔
وہ گہری نیند میں تھی، اُس کے لمس سے نہیں جاگی تھی۔ اپنی جیب سے مراد نے موتیا کے پھولوں کا ایک ہار

نکالا تھا اور بے حد نرمی سے اُس کی کلائی میں لپیٹ دیا۔ پھر اُس نرمی سے اُس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں اور ماتھے سے لگایا اور اُس کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ جتنی خاموشی سے آیا تھا، اُس ہی خاموشی سے چلا گیا تھا، اور شاید وہ اُسی وقت جا چکی تھی جب وہ کمرے کی دہلیز سے نکل رہا تھا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے موتیا نے کوئی سایہ دیکھا تھا جو غائب ہو گیا تھا۔ وہ اُسی طرح بستر میں لیٹی رہی۔ اُس نے خواب میں دیکھا تھا۔ مراد اُس کے کمرے میں اُس کے پاس آیا تھا اور پھر وہ اُس کے پاس بیٹھا اور اُس کی کلائی میں موتیا کا ہار پہنانے والا تھا، جب اُس کی آنکھ کھل گئی تھی اور کھلی آنکھوں کے ساتھ دروازے کے سائے کے بعد جو پہلی چیز اُس نے دیکھی تھی وہ اپنی کلائی میں بندھا موتیا کا وہ ہار تھا۔ اُس نے لیٹے لیٹے عجیب حیران نظروں سے اُس ہار کو دیکھا تھا۔

کبھی کبھی خواب اور حقیقت یوں جڑ جاتے ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ خواب کی زمین کون سی ہے اور حقیقت کی دُنیا کہاں۔

اُس نے موتیے کا وہ ہار اپنی ناک کے پاس لا کر اُسے سونگھا تھا، پھر ہاتھوں سے اُس کے پھولوں کو چھوا اور دیکھا۔ وہ پھول موتیا کے تھے اور سفید تھے۔ وہ ہار جو مراد نے اُسے خواب میں پہنانا چاہا تھا، وہ موتیا کے پھولوں کا تھا پر اُن کا رنگ سُرخ تھا۔ خون جیسا سرخ۔

☆☆☆

حویلی کا برآمدہ مٹھائی کے ٹوکروں اور پھلوں کے کریٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ تاجور نے اُس سامان کو دیکھتے ہوئے اپنے چہرے کا اُڑتا ہوا رنگ چھپایا تھا۔ وہ سب کچھ چوہدری شجاع نے منگوایا تھا۔ اُس سے پوچھے اور اُسے بتائے بغیر۔ وہ برآمدے میں ایک نظر اُس سارے سامان کو دیکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی جہاں چوہدری شجاع تیار ہو رہا تھا۔

''اکیلے جائیں گے؟''

اپنا شملہ پہنتے ہوئے چوہدری شجاع اُس کے جملے پر حیران ہوا تھا۔

''خواہش تھی کہ تم ساتھ چلتیں۔ یہ کام تو عورتوں کا ہی ہوتا ہے مگر.....''

اُس نے چوہدری شجاع کی بات کاٹ دی۔

''کیا اگر مگر چوہدری صاحب؟ میں نے بہت سوچا ہے اور مجھے لگتا ہے میں نے واقعی غلطی کی تھی۔ اب اُس غلطی کو ٹھیک کرنے کا ایک موقع مل رہا ہے، تو مجھے اُسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

اندر آتے ہوئے مراد نے تاجور کے اُس جملے کو اُتنی بے یقینی سے سنا تھا جس بے یقینی سے شجاع نے۔ لیکن جہاں شجاع کھٹکا تھا، وہیں مراد باغ باغ ہو گیا تھا۔ اُس نے جیسے ماں کو اُس کے ایک جملے پر ہی معاف کر دیا تھا۔

''امی کو ساتھ لے کر جائیں ابا!''

اُس نے تاجور کو دیکھ کر باپ سے کہا تھا، اور تاجور نے اُسے ساتھ لگا لیا تھا۔

''تیرے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں مراد..... کچھ بھی۔''

اُس نے مراد سے کہا تھا جو ابی طور پر بڑی گرم جوشی سے ماں سے بغل گیر ہو رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں امی..... میں جانتا ہوں۔''

مراد نے جیسے ماں کی محبت سے مغلوب ہو کر کہا تھا۔

''وقت گزر گیا ہے۔ بس جلدی جلدی تیار ہو کر باہر آ جا۔ میں تب تک مراد کے ساتھ سامان گاڑی میں رکھواتا ہوں۔''

چوہدری شجاع نے عجلت میں باہر نکلتے ہوئے کہا۔ اُن کے جانے کے بعد مراد نے ماں سے کہا۔

''ماہ نور کو کچھ دنوں کے لیے اُس کے گھر بھیج دیں۔ میں نہیں چاہتا وہ یہ سب دیکھے اور اُسے تکلیف ہو۔''
تاجور نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اُس سے کہا۔
''میری بھتیجی کا دل مجھ سے بھی زیادہ بڑا ہے مراد! وہ بھی اُسی طرح ہنستے ہوئے اپنی سوکن کا استقبال کرے گی، جیسے میں کر رہی ہوں۔ تُو ماہ نور کی فکر نہ کر اب۔''
تاجور نے جیسے مراد کا منہ بند کر دیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ ماں کی اس بات کا کیا جواب دے۔
''جوڑا نکالتی ہوں اپنا ہی والا جو پہن کر ماہ نور کا رشتہ مانگنے گئی تھی۔''
وہ بولتے ہوئے جا کر اپنی الماری کھولنے لگی تھی اور مراد کچھ نہ سمجھتے ہوئے کمرے سے نکل آیا تھا۔

☆☆☆

''چوہدرائن تو چھوٹے چوہدری کا رشتہ لے کر موتیا کے گھر جا رہی ہیں چھوٹی چوہدرائن جی!''
ماہ نور کی ایک ملازمہ نے تقریباً تڑپتے ہوئے اُسے خبر سُنائی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے ماہ نور کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ پھر اُس نے اپنا چہرہ بے تاثر رکھتے ہوئے اُس سے کہا۔
''جو بڑوں کی مرضی۔''
ملازمہ دنگ اُس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو کھلا رہی تھی اور مکمل طور پر اُس کی طرف متوجہ تھی۔
''تو جا کر کپڑے دھو بچّوں کے۔''
اُسے وہاں سے ہٹانے کے لئے اُس نے کہا تھا۔
ملازمہ وہاں سے سیدھی باورچی خانے گئی تھی جہاں شکوراں موجود تھی اور اُس نے بلند آواز میں اُسے یہ اطلاع دی تھی۔ لہسن چھیلتی شکوراں وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔
''خبریں تو گاؤں میں بھی پھیلی ہوئی ہیں، مگر چوہدرائن جی نے تو مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔''
اُس نے ماہ نور کی ملازمہ شیلو سے کہا۔
''کس منہ سے بتاتیں وہ..... چوہدرائن جی تو چاہتی ہی نہیں ایسا ہو، پر پتا نہیں اب کیسے مان گئیں۔ مجھے تو چھوٹی چوہدرائن کے لیے دکھ ہو رہا ہے۔ اُن پر ظلم ہو رہا ہے۔''
شیلو نے آہ بھر کر کہا اور شکوراں کے ساتھ لہسن چھیلنے بیٹھ گئی۔
''پتا نہیں ظلم کس پر ہوا اور کس نے کیا؟ بس اللہ سب کو ہدایت دے اور سب کو معاف کر دے۔''
شیلو نے شکوراں کے جملے پر جیسے بے حد حیران ہو کر اُسے دیکھا تھا۔

☆☆☆

تاجور نے موتیا کے گھر کے دروازے کو دیکھا اور اُسے یاد آیا تھا وہ کتنے تکبر سے مراد کی بارات اُس کے گھر کے دروازے کے باہر سے لے گئی تھی اور آج وہ وہاں کھڑی تھی، دروازہ کھلا تھا اور اللہ وسائی اُن کے استقبال کے لیے کھڑی تھی۔ پوری گلی کے دروازوں سے گاؤں کی عورتیں اور بچے باہر جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ چوہدری کمیوں کے گھر رشتہ لینے آئے تھے۔ یہ منظر شاید وہ پہلی اور آخری بار ہی دیکھ رہے تھے۔
اللہ وسائی سے گلے ملتے ہوئے تاجور نے سوچا کہ اُس نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا کہ اُسے یہ دن دیکھنا پڑ رہا تھا۔ یہ عورتیں اُس کے پیروں میں بیٹھی ہوتی تھیں، اور آج وہ اُسے دنیا دکھاوے کے لیے گلے لگانے پر مجبور تھی۔
''جی آیاں نوں!''

اللہ وسائی نے انہیں کہا تھا، اُس کی زبان پر کوئی گلہ آیا تھا نہ اُس کے چہرے اور آنکھوں میں نفرت چھلکی تھی۔ وہ بڑا دل کر کے چوہدریوں سے مل رہی تھی۔ جو موتیا پر ہوا تھا، وہ بھی معاف کر کے۔ جو گاموپر گزری تھی، وہ بھی بھلا کر۔

صحن میں پڑی چارپائیوں پر رنگ دار کھیس ڈال کر اُن کے بٹھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ تاجور اور چوہدری شجاع دونوں بیٹھ گئے تھے۔

''اپنی بیٹی کو ہماری بیٹی بنا دیں بہن جی۔''

چوہدری شجاع نے کسی تمہید کے بغیر بیٹھتے ہی کہا تھا۔

''اس گھر میں موتیا کے لیے ہمیں بہت پہلے آنا تھا۔ یہ ہماری کوتاہی تھی کہ ہم نہیں آئے۔ جو بھی ہم سے ہوا، ہمیں معاف کر دیں پر موتیا کو ہماری بیٹی بنا دیں۔''

چوہدری شجاع کہہ رہا تھا اور تاجور کو اُس کے برابر بیٹھے لگ رہا تھا جیسے کوئی اُس کے سر پر جوتے مار رہا ہو۔ چوہدری شجاع کے الفاظ نے جیسے اُسے مجرم بنا کر وہاں بٹھا دیا تھا۔

''بس چوہدری جی اور کچھ نہ کہنا اب..... آپ دونوں خود چل کر آ گئے ہمارے گھر، ہم نے سب معاف کیا۔ موتیا آپ کی بیٹی ہے۔ جب چاہے لے جائیں۔''

اللہ وسائی نے تاجور کو جیسے مزید شرمندگی سے بچا لیا۔

''جاؤ تاجور، یہ زیور اور کپڑے موتیا کو دے کر آؤ۔''

چوہدری شجاع نے تاجور سے کہا اور ساتھ اُن ڈبوں کی طرف اشارہ کیا جو مراد شہر سے لے کر آیا تھا۔ تاجور نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اللہ وسائی کو دیکھا اور پھر وہ ڈبے اٹھاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اللہ وسائی اُس کے پیچھے آئی تھی۔

کمرے میں موتیا اچھے سے کپڑے پہن کر بیٹھی ہوئی تھی اور تاجور کے قدموں کی آواز پر اُس نے سر اُٹھا کر اُس کو دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں اور پھر بہت دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر تاجور نے آگے بڑھ کر وہ ڈبے اُسی چارپائی پر رکھ دیئے تھے، جس پر موتیا بیٹھی ہوئی تھی اور وہ خود بھی وہیں بیٹھ گئی تھی۔

''یہ مجھے پہچانتی ہے؟''

تاجور نے موتیا کی نظروں سے جیسے گھبرا کر اللہ وسائی سے پوچھا تھا۔

''ہاں جی! سب کو پہچانتی ہے۔ اب تو بولتی بھی ہے، پر بہت تھوڑا۔ پر مجھے پکا یقین ہے جس رب سوہنے نے زبان لوٹائی ہے، وہ موتیا کو پہلے جیسا کر دے گا۔''

اللہ وسائی نے بے حد خوشی اور یقین سے کہا۔ تاجور نے ایک بار پھر موتیا کو دیکھا اور وہ اُن آنکھوں کی تاب نہیں لا سکی۔ اُس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جس نے اُسے نظریں چرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اپنے بیگ کو کھول کر اُس نے اس میں سے کچھ روپے نکالے اور موتیا کا ہاتھ پکڑنا چاہا اور اُس میں پہنا ہوا ہار دیکھا۔ اُن نوٹوں کو موتیا کے ہاتھ میں رکھنے کے لیے اُس نے موتیا کا ہاتھ کھولنا چاہا، وہ نہیں کھول سکی۔ اُس نے ہاتھ مٹھی کی طرح بھینچ لیا تھا۔ تاجور نے موتیا کو دیکھا پھر اُس کی مٹھی کھولنے کے لیے جیسے جدوجہد کی اور ایک بار پھر ناکام رہی۔ وہ مشتعل ہوئی تھی۔

''ہاتھ کھولو موتیا، ہاتھ کھولو!''

اللہ وسائی جیسے تاجور کی مدد کو آئی اور اُس نے بھی موتیا کی مٹھی کھلوانی چاہی وہ بھی ناکام رہی اور اُس نے کچھ شرمندہ ہو کر تاجور کو دیکھا۔

''رہنے دو، تم رکھ لو۔''

تاجور نے بے حد سرد مہری سے کہا تھا اور وہ نوٹ اللہ وسائی کو پکڑا دیئے تھے۔ اللہ وسائی نے ساتھ ہی اُس سے کہا۔

''میں شربت لے کر آئی جی بس دو منٹ!''

تاجور کے روکتے روکتے بھی وہ وہاں سے چلی گئی تھی اور اُس کے جانے کے بعد تاجور نے ایک بار پھر موتیا کو دیکھا۔

''تجھے مراد ہی کیوں چاہیے تھا؟ کوئی اور بھی مل سکتا تھا تجھے..... وہ دو بچوں کا باپ ہے۔ تو نے پتا نہیں کیا جادو کیا ہے اُس پر..... کیا پڑھ کر پھونکا ہے کہ اپنے حواس میں ہی نہیں ہے وہ۔''

تاجور یہ سب کہنے وہاں نہیں آئی تھی مگر یہ سب کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ اُس کا خیال تھا وہ اُسے جو کچھ کہہ رہی تھی، اُس کا کوئی جواب اُسے نہیں ملے گا نہ ہی وہ اُن باتوں کو دہرا پائے گی۔

موتیا اُس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اُس نے تاجور کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ کھول دیئے۔ اُس کے ہاتھوں پر مہندی تھی اور مہندی میں مراد کا نام لکھا ہوا تھا۔ تاجور کی آنکھوں میں جیسے خون اُمڈ آیا تھا۔

اُس نے آگے بڑھ کر موتیا کا ماتھا چوما اور اُس سے کہا۔

''نام ہتھیلی پر لکھ لینے سے نصیب نہیں بدلتا۔''

اندر شربت کا گلاس لاتی ہوئی اللہ وسائی نے اُس کا جملہ نہیں سُنا تھا۔ بس تاجور کو موتیا کا ماتھا چومتے دیکھا تھا اور وہ نہال ہو گئی تھی۔

''میری داڑھ میں درد ہے اللہ وسائی..... یہ ٹھنڈا میٹھا شربت نہیں پی سکتی۔ تیاریاں کرنی ہیں، بس چلتی ہوں۔ موتیا کے لیے شگن کی مٹھائی بھیجوں گی اُسے ضرور کھلانا..... ہمارے خاندانی لڈو۔''

اُس نے کہا تھا اور اللہ وسائی کو ایک بار پھر گلے سے لگا کر وہ باہر نکل گئی تھی۔

چوہدریوں کے گھر سے جانے کے بعد سارے گاؤں کی عورتیں مبارک باد کے ساتھ جیسے اللہ وسائی کے گھر اُمڈ آئی تھیں۔ اللہ وسائی نے مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے صحن میں رکھ کر جیسے گاؤں والوں کے لیے کھول دیئے تھے۔ گاؤں کی عورتوں نے پھل اور مٹھائی کھاتے ہوئے ڈھولک پر شادی بیاہ کے گیت گانے شروع کر دیئے تھے۔ وہاں جیسے عید جیسا سماں ہو گیا تھا۔

☆☆☆

موتیا کے گھر سے حویلی تک واپسی کا سفر جیسے تاجور کے لیے قیامت کا سفر تھا۔ پورے گاؤں کے سامنے سر اور ناک نیچی کر کے موتیا کے گھر رشتے کے لیے جانا تاجور کیسے پل بھر میں بھول جاتی۔

حویلی کے اندر جاتے ہی اُس کا سامنا ماہ نور سے ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ تاجور نے آگے بڑھ کر اُس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

''تیرا سہاگ کسی اور کا نہیں ہو گا ماہ نور! تجھے زبان دی ہے تو تاجور زبان سے نہیں پھرے گی۔''

اُس نے مدھم آواز میں ماہ نور کے کانوں میں سرگوشی نہیں کی تھی جیسے امرت گھول دیا تھا۔

''اپنا کمرہ مراد کو دے دے اور اُسے کہہ کہ وہ اُسے سجا لے موتیا کے لیے..... اُسے یقین دلا دے کہ تجھے اور مجھے کوئی اعتراض نہیں رہا اس شادی پر۔ ہم اُس کی خوشی میں راضی ہیں۔''

اُس نے ماہ نور کو الگ کرتے ہوئے اُسی دھیمی آواز میں کہا تھا۔ ماہ نور نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ تاجور اگر اُسے یہ سب کہہ رہی تھی تو یقیناً وہ کچھ ٹھان کر بیٹھی تھی اور جو وہ ٹھان کر بیٹھی تھی اُس کے

ہونے پر ماہ نور کو اندھا یقین تھا۔
ایک منصوبہ انسان کا ہوتا ہے، ایک منصوبہ رحمان کا..... اور اگر انسان رحمان کے منصوبے کو جان سکتا تو وہ
بھی جان جاتی کہ اُس گڑھے میں نہ گرتا جو اُس کے اپنے منصوبوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

"یہ تمہارا کمرہ ہے ماہ نور، یہاں موتیا کو نہیں لاؤں گا میں۔ تمہاری کوئی چیز تم سے لے کر اُسے نہیں دوں گا۔"
مراد نے دوٹوک انداز میں ماہ نور کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ کمرے کی چابی اور زیورات کی الماری کی چابی اُسے دینے آئی تھی اور وہ برہم ہو گیا تھا۔
"اس حویلی میں بہت کمرے ہیں۔ میں اُسے چند دنوں کے لیے کہیں بھی رکھ سکتا ہوں۔"
"آپ کا کمرہ حویلی کا سب سے اچھا کمرہ ہے۔ آپ اُسے وہاں رکھیں۔ میں بچوں کے ساتھ کہیں بھی رہ لوں گی۔"
ماہ نور نے اُس سے کہا تھا۔
"میں تم سے اور بچوں سے بہترین کمرہ نہیں چھینوں گا۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔"
مراد نے جواباً کہا تھا۔
"میری ماں نے مجھے موتیا سے چھین کر تمہارا بنایا تھا، پر میں تم سے کچھ بھی چھین کر موتیا کو نہیں دوں گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔
"موتیا اس حالت میں نہ ہوتی تو میں خوش ہوتا۔ وہ اگر کسی دوسرے کی ہو جاتی تب بھی۔ اگر وہ اُسے خوش رکھ سکتا۔ نہ میں ضد میں ہوں، نہ میں محبت کا اتنا مارا ہوں کہ اُس کے بغیر نہ رہ سکوں، لیکن میں کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی ماں اور اپنے گناہ کا کفارا ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کو اِس حال میں میں نے پہنچایا ہے، تو نکالنا بھی مجھے ہے۔"
وہ ایک بار پھر ماہ نور کو جیسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اُس کا بھی ہے۔
"محبت کے مارے نہیں ہیں اور اُس کے بغیر جی سکتے ہیں تو اُس سے نکاح کیے بغیر بھی اُس کی مدد کر سکتے ہیں۔"
ماہ نور نے عجیب سے لہجہ میں جیسے اُس کا جملہ اُس پر پھینکا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہا، پھر اُس نے کہا۔
"تم میرے اور اُس کے تعلق کو سمجھ ہی نہیں سکتیں ماہ نور..... نہ یہ نکاح کا محتاج ہے، نہ یہ جسم کی طلب ہے۔ وہ میری روح کا حصہ ہے..... مرتے وقت بھی میرے ساتھ رہے گی، چاہے کہیں بھی ہو، کسی کے بھی ساتھ ہو۔ یہ تعلق میں توڑ سکتا تو اُس دن ہی توڑ دیتا جب میں نے اُس پر شک کر کے اُسے چھوڑا تھا، پر ماہ نور میں اُس سے تعلق نہیں توڑ سکا نہ توڑ سکتا ہوں۔ تعلق توڑ نہ سکے انسان تو پھر جوڑ لینا چاہیے۔"
ماہ نور اُس مرد کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ اُسے جو داستان امیر حمزہ سنا رہا تھا، اُسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ مراد کی موتیا نہیں تھی، ماہ نور تھی۔ حسد کر سکتی تھی، صبر نہیں کر سکتی تھی۔ مگر وہ سامنے بیٹھے ہوئے مرد سے کوئی گلہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے اُسے کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ کبھی بُرا سلوک نہیں کیا تھا۔ بُرا لفظ نہیں کہا تھا۔ کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ اور وہ اُس سے وعدہ کر رہا تھا کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا، پھر بھی صبر نہیں ہو رہا تھا۔

مراد نے ایک بار پھر اُسے سینے سے لگایا تھا۔ وہ اُسے تھپک رہا تھا، یقین دلا رہا تھا کہ اُس سے کچھ نہیں چھنا..... نہ تخت، نہ سلطنت..... بس بادشاہ اُس کا نہیں رہا۔

☆☆☆

''زہر لا کر دوں؟ پر کس لیے چوہدرائن جی؟''

شکوراں کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تاجور اُس سے کیا اور کیوں منگوانا چاہ رہی تھی؟

''ساری رات آوارہ کُتے بھونکتے رہتے ہیں حویلی کے اردگرد، اُن کو مارنے کے لیے چاہیے۔ تو نہیں سُنتی ساری ساری رات کتوں کا بھونکنا؟''

تاجور نے جواباً اُسے جھڑکتے ہوئے کہا تھا۔

''حکیم صاحب سے لا کر دینا ایسا زہر کہ تڑپ تڑپ کر مریں یہ سارے کتے..... بدشگونی کر رکھی ہے اُنہوں نے!''

اُس نے چند نوٹ شکوراں کو دیئے تھے اور چلی گئی تھی۔ شکوراں عجیب سی کیفیت میں وہ نوٹ پکڑے کھڑی رہی، اُس کی ساری زندگی میں آج پہلی بار تاجور نے کتے مارنے کے لیے زہر منگوایا تھا، ورنہ گاؤں میں آوارہ کتے تو سالوں سے تھے اور وہ اتنا بھونکتے بھی نہیں تھے جتنا وہ کہہ رہی تھی۔

شکوراں کا جسم یک دم ٹھنڈا ٹھار پڑ رہا تھا۔ کہیں یہ زہر موتیا کے لیے تو..... وہ آگے کا سوچ ہی نہیں پائی۔ اُس نے تاجور کو زہر حکیم سے لا دیا تھا پر لپکتے جھپکتے وہ گھر پہنچی تھی اور اُس نے بتول کو سارا واقعہ سنا دیا تھا اور ساتھ اپنا شک بھی۔

''تو نے کیوں لا کر دیا ہے زہر اماں! ایک گناہ مجھ سے ہوا ہے میں پچھتا رہی ہوں۔ اُس سے بڑا گناہ نہ کر بیٹھنا۔''

بتول نے لرز کر اُس سے کہا تھا۔

''ہوسکتا ہے بتول تو اور میں خوامخواہ وہم ہی کر رہے ہوں اور چوہدرائن نے واقعی کتوں کے لیے ہی منگوایا ہو۔ انسان کو کیسے مار سکتی ہیں وہ؟''

شکوراں نے جیسے خود کو تسلی دینے والے انداز میں کہتے ہوئے بتول کو دیکھا۔

''جو کتوں کو مار سکتا ہے، وہ انسان کو بھی مار سکتا ہے اماں..... تو چوہدرائن کو نہیں جانتی، میں جانتی ہوں۔ اتنے سالوں بعد موتیا کا نصیب کھل رہا ہے۔ اُس کے گھر خوشی آ رہی ہے، تو آنے دے اماں۔''

بتول نے اُس سے جیسے التجا کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ شکوراں پچھتائی تھی۔

☆☆☆

ماہ نور ٹھنڈے جسم کے ساتھ تاجور کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ جو حل وہ اُس کے سامنے رکھ رہی تھی، اُسے سُن کر ایک لمحہ کے لیے تو ماہ نور کو پسینہ ہی آ گیا تھا۔

''اُسے زہر دے کر مار دیں مگر پھوپھو.....''

اُس نے کچھ کہنا چاہا اور تاجور نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''تیرے پاس اگر مگر کا راستہ ہی نہیں ہے ماہ نور..... یا تو رحم کھا لے یا اپنا گھر تڑوا لے۔''

تاجور نے کہا تھا۔

''اتنے گناہ کیے ہیں زندگی میں ایک گناہ اور سہی! بیٹے، شوہر اور باپ کی نظروں سے تو گر ہی گئی ہوں پہلے۔ اب اپنی نظروں میں گر کے جی نہیں سکوں گی۔ اپنی نسل کمی کمینوں کے ساتھ نہیں ملا سکتی میں۔''

تاجور نے دوٹوک انداز میں اعلان کیا تھا۔
''تو ساتھ آئے یا نہ آئے، میں موتیا کو زہر دوں گی۔''
ماہ نور نے یکدم اپنا ہاتھ تاجور کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔
''میں آپ کے ساتھ ہوں پھوپھو۔''
تاجور اُسے دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

اپنے بیٹے کی دوسری شادی کبھی کسی ماں نے اتنی دھوم دھام سے نہیں رچائی ہوگی جتنی تاجور نے رچائی تھی۔ ماہ نور اور اپنے آپ کو ہر شک سے بچانے کے لیے یہ ضروری تھا۔
تین دن پہلے تاجور نے حویلی میں ڈھولک بھی رکھوا دی تھی اور چراغاں بھی کروا دیا تھا اور یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے مراد بار بار سوچتا رہا کہ اُس کی ماں اُتنی بری نہیں تھی جتنا اُس نے سمجھ لیا تھا۔ وہ آخری ملاقات کے بعد سے موتیا سے نہیں ملا تھا کیونکہ وہ اب مایوں بیٹھی ہوئی تھی۔
لیکن مراد کو یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ موتیا کے ساتھ آخری ملاقات کر چکا تھا۔ وہ دونوں اب دوبارہ کبھی ملنے والے نہیں تھے

☆☆☆

وہ زہر ایک رات پہلے تاجور اور ماہ نور نے شگن کے لڈوؤں کے اُس تھال میں ملایا تھا جو موتیا کے گھر بارات والے دن بھیجا جانا تھا۔ وہ دونوں آدھی رات کو حلوائی کے بنائے ہوئے لڈوؤں میں وہ زہر ملا کر لڈو دوبارہ بناتی رہیں اور ساتھ بہت کچھ سوچتی رہیں۔
''اگر اُس نے لڈو نہ کھایا تو؟'' ماہ نور کو ایک وہم ہوا۔
''شکوراں لے کر جائے گی اور اپنے ہاتھ سے کھلائے گی۔''
تاجور نے مطمئن انداز میں کہا۔
''اور اگر لوگوں کو شک ہو گیا اور شکوراں نے بتا دیا تو؟'' ماہ نور کو فکر ہوئی۔
''کیا بتائے گی وہ؟ لڈوؤں کے تھال تو سارے گاؤں والوں کے لیے ہیں اور شکوراں کو یہ تھوڑی پتا ہے کہ اس میں زہر ہے۔''
تاجور کا اطمینان برقرار تھا۔
''لوگ پھر بھی شک کر سکتے ہیں۔'' ماہ نور بے چین تھی۔
''کرتے رہیں..... مر تو کوئی بھی سکتا ہے اور موتیا تو ویسے بھی بیمار ہے۔ کچھ نہیں ہوگا ماہ نور..... تو ایسے ہی پریشان ہو رہی ہے۔''
تاجور نے اُسے تسلی دی تھی۔ پتا نہیں ماہ نور کو تسلی ہوئی یا نہیں، پر وہ لڈو بناتی رہی تھی۔

☆☆☆

دیساں دا راجہ میرے بابل دا پیارا
امڑی دے دل دا سہارا
نی ویر میرا گوڑی چڑیا
گوڑی چڑیا نی سیوں گوڑی چڑیا

حویلی کے باہر کھڑے بینڈ باجے والے بارات کے تیار ہونے کے انتظار میں شادی بیاہ کے گانوں کی

دھنیں بجا رہے تھے اور بالکل اُس ہی وقت تاجور نے سُرخ کڑھائی والے کپڑے کے ساتھ ڈھکا ہوا لڈوؤں کا ایک تھال شکوراں کو تھماتے ہوئے کہا تھا۔

''شگن کے لڈو ہیں، دُلہن کے لیے۔ جا کر موتیا کو کھلا آؤ..... میں ابھی گاؤں میں بھی بٹوانے کے لیے بھجوا رہی ہوں۔''

شکوراں نے بے حد خوشی سے تھال تھاما تھا اور پھر ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''چوہدرائن جی، جوڑا لوں گی شگن کے لڈو دلہن کو کھلانے کے لیے.....''

تاجور اُس کی بات پر ہنسی۔

''ایک نہیں دو جوڑے لے لینا۔ ایک اپنا اور ایک بتول کا۔ پر اپنے ہاتھ سے کھلا کر آنا موتیا کو پورا لڈو۔''

شکوراں نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''جی جی اپنے ہاتھ سے ہی کھلاؤں گی!''

وہ کہتے ہوئے تاجور کے کمرے سے نکل آئی تھی اور نکلتے ہوئے اُس کو عجیب سا وسوسہ آیا۔ وہ تھال تاجور نے اُسے کمرے میں کیوں دی تھی جبکہ باقی سارے لڈو تو حویلی کے باورچی خانے میں رکھے ہوئے تھے۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب شکوراں کو وہ زہر بھی یاد آیا اور تاجور کی وہ تاکید بھی کہ وہ اپنے ہاتھ سے لڈو موتیا کو کھلا کر آئے۔

اُس کا دل پتے کی طرح کانپا تھا۔ بے اختیار وہ باورچی خانے کی طرف آئی تھی۔ وہاں بہت سارے تھال تھے لڈوؤں کے۔ شکوراں نے وہ تھال وہاں رکھ کر اُس کا کپڑا اُٹھا کر ایک دوسرے تھال پر ڈالا اور تھال اُٹھا لیا۔

اُس کا دل یک دم مطمئن ہوا تھا۔

''میں خوامخواہ ہی غلط سوچ رہی تھی..... چوہدرائن جی کبھی ایسا نہیں کر سکتیں۔ اور اگر ایسا ہوا بھی تو کم از کم میرے تھال کے لڈو میں تو زہر نہیں ہوگا موتیا کے لیے۔''

''سُن شیلو! یہ تھال رکھا ہے میں نے لڈوؤں کا..... بلّی منہ مار گئی ہے انہیں۔ ذرا باہر پھنکوا دینا۔''

اُس نے اندر آتی ہوئی شیلو سے کہا اور خود باہر نکل آئی۔ شکوراں کو یقین تھا کہ چوہدرائن پر وہ خوامخواہ شک کر رہی تھی، پھر بھی اُس نے اپنی طرف سے ساری احتیاطی تدابیر اختیار کر لیں۔ پر ایک چیز قسمت ہوتی ہے اور ایک چیز بدقسمتی، اور حویلی والوں کے گھر میں اُس دن بدقسمتی کا راج تھا۔ اُس راج کو شکوراں کیسے توڑ سکتی تھی؟ شیلو نے شکوراں کی ہدایت سُن کر ہاں بھی کہہ دی تھی، مگر اُس پر عمل نہیں کیا تھا۔ وہ اس وقت لڈو بانٹنے کے لیے لڈوؤں کے تھال لینے آئی ہوئی تھی، نہ کہ لڈو پھینکنے کے لیے۔ وہ دوبارہ باورچی خانہ میں آئی تھی تو وہ شکوراں کی ہدایت بھی بھول چکی تھی اور یہ بھی کہ لڈوؤں کے کس تھال کو شکوراں نے پھینکنے کا کہا تھا۔

☆☆☆

تاجور دُولہا بنے مراد کو دیکھ کر اُس سے نظریں ہی نہیں ہٹا سکی۔ وہ روپ اُس پر تب بھی آیا تھا جب وہ ماہ نور کو بیاہنے گیا تھا، مگر آج تو کوئی اور ہی روپ آیا ہوا تھا اُس پر۔

''اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں مجھے؟ کیا پیارا نہیں لگ رہا؟''

مراد نے مسکراتے ہوئے ماں سے کہا تھا۔

''تُو تو ماں کی آنکھوں کا تارا ہے! تو کیوں پیارا نہیں لگے گا؟ اللہ نظرِ بد سے بچائے تجھے۔''

تاجور نے اپنی آنکھ سے انگلی سے تھوڑا سا کاجل نکال کر اُس کے ماتھے کے ایک کونے پر لگایا تھا اور اُس سے نظریں ہٹالی تھیں۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس ماں اور باپ کے ساتھ چلتے ہوئے صحن میں آیا تھا، جہاں وہ

کرسی رکھی ہوئی تھی جس پر بیٹھ کر اُس نے ماں سے سہرا بندھوانا تھا۔ اوپری منزل کے چھجے سے ماہ نور نے مراد کو دیکھا تھا اور اُس کے دل سے ہوک اُٹھی تھی۔ وہ شہزادہ اُس کا تھا اور کسی اور کو بیاہنے جا رہا تھا اور وہ اُس شہزادی کی موت کا انتظار کر رہی تھی جسے اس حویلی کی ملکہ بن کر آنا تھا۔

کرسی پر بٹھا کر سہرا بندی کی رسم شروع کرنے سے پہلے چوہدری شجاع نے ملازم کو مٹھائی لانے کے لیے کہا تھا اور ملازم چند منٹوں میں لڈوؤں کا وہی تھال لے آیا تھا جو تاجور نے شکوراں کو موتیا کے گھر لے جانے کے لیے دیا تھا۔

''پہلے منہ میٹھا کروا دو بیٹے کا، پھر ہار پھول پہناتے ہیں۔''

چوہدری صاحب نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ تاجور نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے تھال میں سے ایک لڈو اُٹھایا اور لڈو اُٹھاتے ہوئے وہ تھال دیکھ کر اُلجھی تھی۔ اُسے لگا تھا کہ وہ وہی تھال تھا جو اُس نے شکوراں کو دیا تھا کیونکہ وہ لڈو اُس نے اور ماہ نور نے کچھ مختلف طریقے سے بنائے اور سجائے تھے اور پھر خاص ترتیب سے چاندی کے ورق لگا کر اُنہیں تھال میں رکھا تھا۔ لیکن پھر اُسے لگا کہ اُسے وہم ہو رہا تھا۔ وہ تھال تو کتنی دیر پہلے شکوراں لے کر جا چکی تھی۔ اپنے سامنے اُس نے اُسے حویلی کے دروازے سے تھال سمیت نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور اب تک تو وہ یقیناً موتیا کو لڈو کھلا چکی ہوگی اور کسی وقت بھی وہاں موتیا کی موت کی خبر آنے والی تھی۔

اپنے وہم کو سر سے جھٹک کر اُس نے لڈو اُٹھایا تھا اور مراد کے منہ میں رکھا تھا، جو وہ ہنستے ہوئے سارا ہی کھا گیا تھا۔ تاجور نے بھی ہنستے ہوئے اُسے لڈو کھانے دیا تھا۔ لڈو کھاتے کھاتے اُس نے مراد کے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے تھے۔ وہ اپنا گلا پکڑ رہا تھا، یوں جیسے وہ لڈو اُس کے حلق میں اٹک گیا ہو۔ تاجور نے عجیب سی کیفیت میں اُسے دیکھا تھا اور پھر اُس ہی لمحہ حویلی کے صحن میں داخل ہوتی ہوئی شکوراں کو جو بڑے اطمینان سے آ رہی تھی۔

کسی نے تاجور کے کلیجے پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ چیخی تھی۔

''مراد لڈو تھوک دے..... مت نگل!''

دیر ہو چکی تھی۔ مراد اپنا گلا پکڑتے ہوئے فرش پر گرا تھا اور کچھ بھی کہے بغیر تڑپنے لگا تھا۔ اوپر چھجے میں بیٹھی ماہ نور چیخ مار کر نیچے کی طرف دوڑی تھی۔

''سانس لے مراد..... سانس لے!''

تاجور روتے اور چلاتے ہوئے اُس سے کہہ رہی تھی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ چوہدری شجاع چلا رہا تھا۔ حویلی کے ملازم بھاگ رہے تھے۔ کوئی پانی لا رہا تھا، کوئی ڈاکٹر اور حکیم کو بلانے بھاگا۔ کوئی گاڑی حویلی کے صحن میں لانے کے لیے اور اِن سب کے بیچوں بیچ شکوراں نے کسی ملازم سے سُنا تھا۔ ''چوہدری مراد نے لڈو کھایا ہے اور کچھ ہو گیا ہے اُنہیں۔'' شکوراں بھاگتی ہوئی تاجور، ماہ نور اور چوہدری شجاع کے پاس آئی تھی۔ مراد ساکت اب تاجور کی گود میں سر رکھے ہوا تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے خون اور جھاگ نکل رہا تھا۔ تاجور اور ماہ نور چیخیں مار رہی تھیں اور چوہدری شجاع دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ''پھوپھو آپ نے موتیا کو زہر والے لڈو کھلانے تھے..... آپ نے میرے ہاتھوں سے میرے ہی شوہر کے لیے زہر والے لڈو بنا کر اُسے کھلا دیئے۔'' ماہ نور چیختی ہوئی تاجور سے کہہ رہی تھی اور وہاں کھڑے ہر شخص کو چند لمحوں میں ہی پتا چل گیا کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ تاجور یک دم جیسے تماشا بن گئی تھی۔ اُس نے اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے زہر دے کر مار دیا تھا۔ وہاں کھڑے لوگ کان پکڑ کر توبہ کر رہے تھے اور چوہدری شجاع اب تاجور کو قتل کر دینے کے لیے لپک رہا تھا اور اُس کے ملازمین اُسے پکڑ

رہے تھے۔ چوہدری مراد کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے گاؤں میں پھیلی تھی اور گاؤں کی عورتیں یہ خبر دینے موتیا کے گھر بھی دوڑی تھیں۔ اُس کے گھر کے دروازے چوپٹ کھلے تھے اور وہاں نہ موتیا تھی، نہ اللہ وسائی۔ اگلے چند گھنٹوں میں گاؤں کے لوگوں نے اُنہیں ہر جگہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اُن دو لوگوں کا کہیں پتا نہیں تھا۔ پھر گاؤں والوں نے سوچا، وہ نہر میں کود گئی ہوں گی۔ شاید مراد کی موت کا صدمہ اُن کے لیے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''تین سال کا تھا جب بھاگ جاتا تھا اور میں پکڑ کر لے آتی تھی۔ اب نہیں پکڑا گیا۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔''

وہ تاجور تھی جو حویلی کے ہر کمرے میں اب مراد کو ڈھونڈتی پھرتی اپنے آپ سے کہتی رہتی تھی، یوں جیسے حویلی میں صرف مراد اور وہی تھے اور کوئی نہیں تھا۔ نہ چوہدری شجاع..... نہ ماہ نور..... نہ اُس کے بچے..... بس وہ اور مراد.....

کئی مہینے چوہدری شجاع نے تاجور سے بات نہیں کی تھی اور پیر ابراہیم اُسے واپس اپنے پاس لے آئے تھے۔ وہ باپ تھے بیٹی گناہ گار سہی، چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ مگر کئی مہینوں بعد اُس کی بگڑتی ذہنی کیفیت دیکھ کر وہ اُسے واپس حویلی لے آئے تھے۔ اُس کا خیال تھا ماہ نور اور بچوں کو دیکھ کر وہ بہل جائے گی، پر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ سارا دن مراد کو حویلی میں ڈھونڈتی پھرتی تھی اور جب تھک ہار جاتی تو اپنے آپ کو کوستی۔

''جا تاجور تیرا بیڑا غرق..... تیرا ستیاناس! تو نے بیٹا مار دیا اپنا۔'' وہ روتی چلاتی اور پھر آخر میں بلند آواز میں کہتی۔ ''میں تاجور نہیں میں موتیا ہوں..... مراد کی موتیا..... موتیا کا مراد.....''

☆☆☆

جھوک جیون میں اُس کے بعد کئی سال پانی نہیں برسا اور آہستہ آہستہ چرند، پرند اور انسان سب اُس بستی کو چھوڑتے گئے جس کا نام کبھی جھوک جیون تھا اور جہاں ایک گاموماشکی ہوتا تھا جس کی مشک کے پانی سے سارے گاؤں کی پیاس بجھتی تھی اور ایک اللہ وسائی تھی جس کی توتلی زبان لوگوں کے زخموں پر مرہم کا کام کرتی تھی، اور ایک موتیا تھی..... مراد کی موتیا..... جس کا دوبارہ کبھی کسی کو پتا نہیں چلا۔

(پہلے حصے کا اختتام)

(کبھی کبھار زندگی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں کہانیاں ختم ہوتی ہیں اور کبھی کبھار زندگی کہانیوں سے زیادہ حیران کن ہوتی ہے۔ کہانیوں سے زیادہ میٹھی اور کہانیوں سے زیادہ کڑوی۔ دانہ پانی یہاں ختم ہوا، مگر اِس کے کرداروں کا سفر نہیں۔ وہ اپنے دانہ پانی کے لیے ہجرت کر کے کہاں پہنچتے ہیں اور کہیں پہنچتے بھی ہیں یا نہیں؟ یہ سب دانہ پانی کے اگلے حصے میں آپ جانیے گا۔ اگلے سال بشرطِ زندگی۔

(عمیرہ احمد)